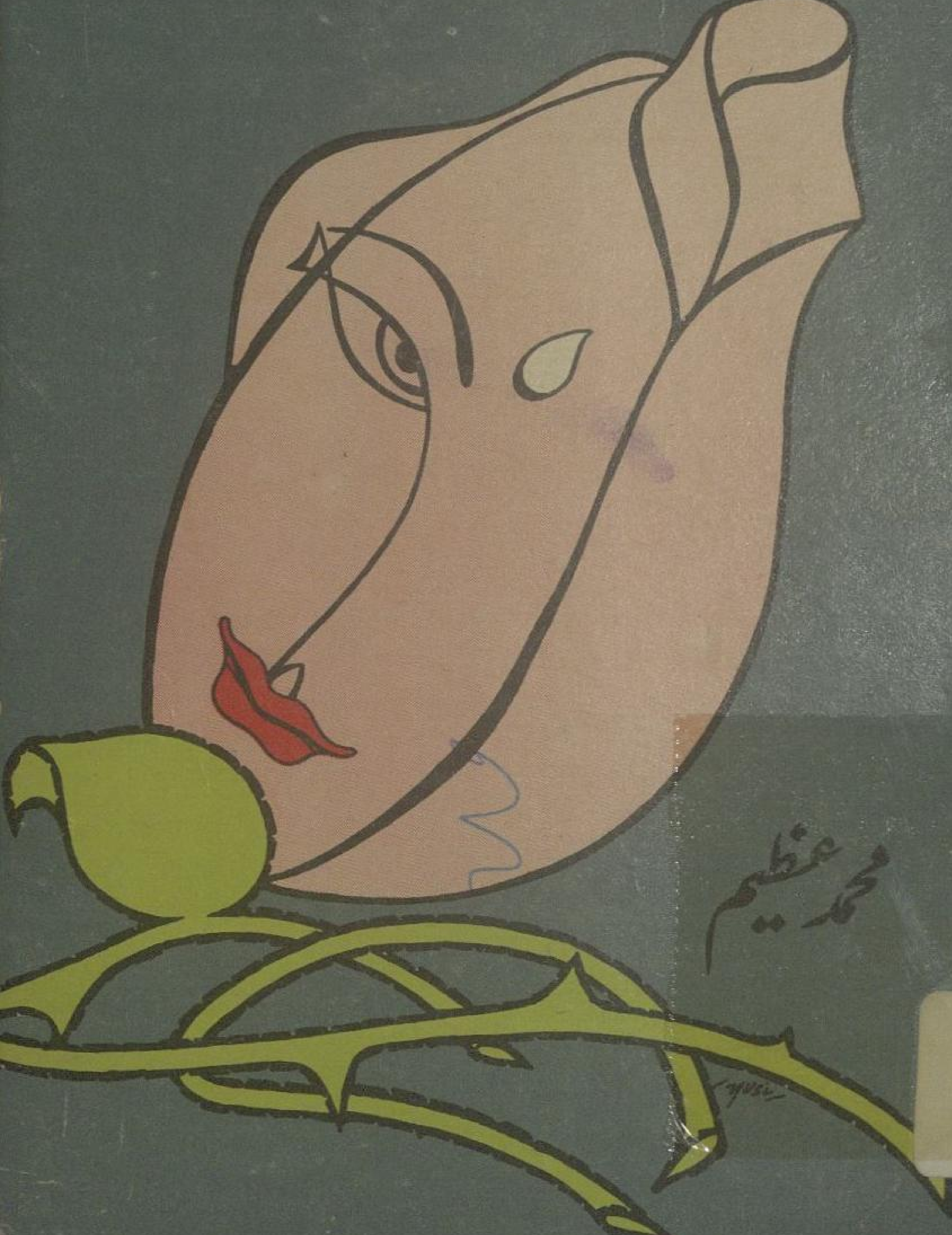
اک کلی مسکائی



محمد عظیم

اِک کلی مسکائی

ناول

محمد عظیم

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور۔ حیدرآباد۔ کراچی

طابع :- شیخ نیاز احمد
مطبع :- غلام علی پبلشرز - لاہور
قیمت : Rs 10..00

مقامِ اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
ادبی مارکیٹ - چوک انارکلی - لاہور

باب ۱

پڑھائی سے اب وہ اس قدر اکتا چکی تھی کہ جی چاہتا تھا کہیں جنگل میں جا بسے جہاں نہ سکول ہوں اور نہ ان میں پڑھائی جانے والی کتابیں۔ بس وہ ہو اور اس کے من چاہے خیالات جن میں وہ ایک آزاد، اور خود مختار ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھرے کوئی روکنے والا نہ ہو۔!

ابھی وہ ایف۔ اے کی تو طالبہ تھی۔ لیکن گھر بھر میں بلکہ خاندان بھر میں اُس کی قابلیتوں اور پڑھا کو طبیعت کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ امّی دوسرے گھروں کی بیبیوں اور ہمسائیوں سے بڑے فخر اور اعتماد کے ساتھ کہتیں:

"بٹیا بڑی محنتی اور ہوشیار ہے۔ میٹرک میں وظیفہ لیا ہے۔ دیکھ لینا پڑھ لکھ کر ڈاکٹرنی بنے گی ——— ہاں"

اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے یہ بات سُن کر کچھ فخر اور کچھ غصّے سے وہ پھول جاتی، غصّہ اس لئے آتا کہ امّی کی انہی باتوں کے سبب اُسے اپنے آپ کو بہت سنجیدہ ظاہر کرنا پڑتا اور ہر وقت کتابوں میں دھیان رکھنا پڑتا۔ اگر کبھی وہ ان سے جان چھڑا کر کوٹھے کی چھت پر چڑھ جاتی اور امّی دیکھ لیتیں تو ایک قیامت سی آجاتی۔

"دیکھو — دیکھو اس لڑکی کی باتیں۔ ایف۔ اے میں پڑھتی ہے اور کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتی —— فیل ہو کر ماں باپ کا نام ڈبوئے گی۔"

یہ بات سُن کر اس کے جوش و خروش پر برف سی پڑ جاتی۔ وہ بُجھی بُجھی نیچے کمرے میں آجاتی اور مردہ دلی سے کتابوں میں سر کھپانے لگتی۔

انہی پابندیوں اور نگرانیوں کے نتیجے میں اُسے زیادہ پڑھنا پڑتا جس کی وجہ سے امتحان میں ہمیشہ اچھے نمبر آتے۔ ہم جماعت لڑکیاں اُسے حسرت سے دیکھتیں اور اس کی طرح محنتی بننے کی دعائیں کرتیں۔ استانیاں اس کی محنت اور قابلیت کو لڑکیوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کرتیں لیکن ——

وہ خود دوسروں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہتی۔ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتی —— قہقہے لگاتی اِدھر اُدھر اچھلتی کودتی لڑکیاں اُسے دنیا کی خوش قسمت ترین مخلوق معلوم ہوتیں۔ اور وہ خود کو ان کے مقابلے میں بدقسمت ترین، ہستی تصوّر کرتی —— جسے کبھی کھل کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے اور ہنسنے کھیلنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔

اس کے باوجود اُس نے خود کو دوسروں کے سامنے کبھی کم تر یا غم زدہ اور مایوس ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ خود کو بڑا لئے دئے رہتی۔ تیلے دبلے جسم کی مالک اور تیکھے نقوش والی یہ لڑکی اپنے جذبات پر بڑا اختیار رکھتی تھی اور انھیں کبھی دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی، یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کے دل کے دُکھ کو کبھی نہ سمجھ سکتے۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی سے ہمیشہ ایک تقدّس اور گہری محویت کا اظہار ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا

تھا کہ دیکھنے والے متاثر ہو کر چپ ہو رہتے۔

اس خاموشی اور سنجیدگی نے اُسے محنت اور ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی روشناس کرا دیا۔ یہ ایک احساس تھا ——— ایک زبردست احساس جسے تنہائی کے نام سے پکارا جاتا۔ وہ اپنے سکول کی لڑکیوں، اپنے گھر کے افراد اور سہیلیوں میں رہتے ہوئے بھی ذہنی طور پر ہمیشہ خود کو اکیلا محسوس کرتی ——— آسمان پر چاند کی طرح یا صحرا میں اکیلے درخت کی طرح تنہا اور اداس — کوئی اس کا ساتھی نہ تھا اور نہ ہی کوئی اس کے احساس کا اندازہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا چہرہ ایک گہرے سمندر کی طرح پُرسکون رہتا تھا۔ جس کی بے پایاں گہرائیوں میں اٹھنے والے طوفانی موجوں کی ہلچل سطح پر بالکل دکھائی نہیں دیتی۔ یہ اپنی طبیعت پر اُس کے اختیار کا اعجاز تھا اور وہ اس بات پر فخر بھی کرتی تھی کہ اس کے خیالوں سے کوئی واقف نہیں۔ وہ سب کو جانتی ہے۔ لیکن کوئی اُسے نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے؟ — کیا سوچتی ہے، کیا چاہتی ہے اور کیا ناپسند کرتی ہے؟

کچھ مُنہ پھٹ اور شریر لڑکیوں نے اُس کا نام مہاتما بدھ کی چیلی رکھا ہُوا تھا اور ظاہری روّیے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیا جا سکتا تھا۔ یہ نام لڑکیوں کے ایک مخصوص حلقے میں ہی مشہور تھا۔ اُسے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی اور نہ عام طالبات ہی کو اس کے بارے میں کچھ علم تھا۔ وجہ یہ تھی کہ لڑکیاں جانتی تھیں کہ رفعت کو اُستانیوں اور ہیڈ مسٹرس کی خوشنودی حاصل تھی۔ اس لئے اس کے متعلق کسی غلط یا ناراض کرنیوالی بات کا اعلان اور اظہار مصیبت میں ڈال

سکتا ہے۔ پھر وہ اس سے خود بھی متاثر تھیں کیونکہ ایسی سنجیدگی اور متانت کی مالک لڑکیاں ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ جو ایسی طبیعت کی مالک ہوں اُن کو آئیڈیل سمجھ کر اُن کی عزت افزائی بلکہ بعض اوقات پرستش تک کی جاتی ہے

ساجدہ اُس کی ایک سہیلی تھی۔ سہیلی کہنا تو شائد اس سلسلے میں کافی نہ ہو ان دونوں کے تعلق کے سلسلے میں کوئی نیا ہی لفظ وضع کرنا پڑے گا۔ وہ دراصل ایک دوسرے کی عاشق تھیں۔ ساجدہ کو رفعت کی سنجیدگی، ذہانت اور حُسنِ سادہ سے پیار تھا۔ دوسری طرف رفعت اس کی چنچل اور نٹ کھٹ طبیعت پر فدا تھی۔ دونوں میں کچھ اتنی گہری وابستگی تھی کہ اُن پر یک جان دو قالب ہونے کا فتویٰ صادر کیا جا سکتا تھا۔ یہ ساجدہ کون تھی ــ ؟

سمن آباد کی چودھویں سٹریٹ کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہنے والی اس لڑکی کا نام ساجدہ تھا۔ وہ ایک تاجر کی بیٹی تھی جو موٹروں کے پرزوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اور خاصا کما رہا تھا۔ ساجدہ کی ایک بہن اور تھی جس کا نام صفیہ تھا۔ اُن دونوں کے مزاج میں خاصا فرق تھا صفیہ کچھ تیز مزاج تھی جب کہ ساجدہ بڑی ٹھنڈی اور سنجیدہ عادت و اطوار کی مالک تھی۔ اُن کا ایک بھائی تھا جس کا نام طارق تھا۔ طارق، ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ اور بڑا خاموش طبیعت۔ اس کا شمار کالج کے سب سے زیادہ وضع دار اور خوبصورت طالب علموں میں" ہوتا تھا۔ اُن کی والدہ ایک محبت کرنے والی عورت تھی۔ اپنے خاوند اور بچّوں سے سچا پیار کرتی تھی۔ گھر کے سربراہ قدیر صاحب اپنی فراخ دلی اور ترقی پسندانہ معاشرتی نقطۂ نظر کی وجہ سے مختلف حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی سوچ کا یہ توہ

گھر پر بھی پڑا تھا اور بیوی خصوصاً بچے بڑے ترقی پسند بلکہ عرفِ عام میں ماڈرن کہلاتے تھے۔ بہنوں اور بھائیوں کے درمیان دوستی کا تعلق زیادہ تھا اور رشتے کا کم۔ اسی طرح کنبے کے سب افراد کا ایک دوسرے سے تعلق جذبات و احساسات کے احترام پر مبنی تھا۔ جو عام ماحول سے ایک منفرد قسم کی چیز تھی۔

رفعت اور طارق کی پہلی ملاقات طارق ہی کے گھر میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی پیاری سہیلی ساجدہ کے ساتھ آئی تھی۔ طارق بڑا شرمیلا لڑکا تھا اور عموماً اپنی بہنوں کی سہیلیوں کے سامنے آنے سے کتراتا تھا۔ اس وجہ سے اُس کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ وہ نہایت شریف اور چھوٹی موٹی سا لڑکا ہے۔ جس میں لڑکیوں کے ساتھ عام دلچسپی کا فقدان ہے۔ رفعت کو اس نے پہلی بار صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ ساجدہ کے ساتھ اس کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی طارق کو وہ اچھی لگی تھی اور دل میں کئی جذبات اُٹھ اُٹھ کر اس کا خون گرماتے رہے تھے لیکن اُس نے ہر خواہش اور ہر جذبے کو قابو میں رکھا تھا تاکہ کسی کو اُس کے متعلق غلط انداز سے سوچنے کا موقع نہ ملے۔

ایک روز وہ کالج سے آرہا تھا ہفتے کا دن تھا۔ دھوپ خاصی تیز تھی کیونکہ ابھی ستمبر ہی جا رہا تھا۔ کالج سے نکل کر وہ سَیر کے موڈ میں اسمبلی ہال کی طرف چل پڑا۔ سواری لینے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کیونکہ پیدل چلنا ایک طرح سے اس کی ہابی تھی۔ الفلاح کے چوک پر آکر اس نے رُک کر کچھ سوچا۔

"کدھر چلنا چاہیئے۔"

پھر اُس نے مُنہ اٹھا کر اسمبلی ہال کی طرف دیکھا اور اُدھر ہی چل پڑا۔ اسمبلی ہال کے ساتھ گھومنے والی سڑک پر لگے ہوئے درختوں کی چھاؤں نے اس کا دل اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ فٹ پاتھ پر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اور گنگناتے ہوئے وہ اسمبلی ہال کے پیچھے نکل آیا جہاں سے ایک سڑک لاہور ہوٹل کی طرف نکل جاتی ہے۔ اس کے ساتھ دو بڑے بڑے خالی میدان ہیں۔ داہنی طرف فلیٹی ہوٹل کی پشت تھی۔ بائیں طرف ہیلتھ ڈائرکٹوریٹ اور اُس کے سامنے لڑکیوں کا کالج۔

اس نے ٹھٹک کر دُور ہی سے دیکھا۔ اِکّا دُکّا لڑکیاں گیٹ سے باہر نکل رہی تھیں، تین چار لڑکوں کی ٹولیاں سامنے والے دفاتر کے قریب سڑک پر کھڑی تھیں۔ وہ سب شائد کالج سے باہر آنے والی لڑکیوں کو تاڑنے والے تھے طارق نے انھیں حقارت سے دیکھا اور لارنس کی طرف جانے کیلئے واپس مُڑنے ہی والا تھا۔ کہ اس نے ایک لڑکے کو کالج کے گیٹ سے ذرا فاصلے پر پہنچ جانے والی لڑکی کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ اُس کے بالکل قریب جا پہنچا تھا۔ طارق نے ویسے ہی یہ دیکھنے کیلئے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ اپنے قدم روک لئے۔ لڑکی اپنے قریب آکر رُک جانے والے لڑکے کی وجہ سے گھبرا گئی تھی اور اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکا بھی اس کے پیچھے پیچھے رہا۔ اب ان کا رُخ طارق کی طرف تھا۔

" گل تے سُنو سوہنیوں ------ " لڑکے نے دوبارہ لڑکی کے قریب پہنچ کر کہا۔ لڑکی چُپ تھی اور گھبراہٹ کے آثار اس کی چال سے صاف طور پر نمایاں تھے طارق نے محسوس کیا کہ لڑکا کوئی لوفر ہے جو لڑکی کو ناجائز طور پر تنگ کر رہا ہے۔

" چلو لارنس وَل چلیئے۔ " لڑکے نے ایک بار پھر کہا۔ اور شائد اس بات

پر لڑکی غصّے کی وجہ سے بے بس ہو گئی یا پھر اُس نے طارق کی موجودگی کو اپنے لئے حفاظت کا موجب سمجھ لیا تھا۔

"زبان بند کر کمینے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اس نے تیزی سے کہا۔ اور اسی لمحہ طارق چونک پڑا۔ آواز اس کی جانی پہچانی تھی۔ اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ رفعت تھی۔

یہ بات تو روزمرّہ کے دیکھنے کی ہے کہ کوئی شخص بھی اس وقت تک کسی عورت کی عزّت و عصمت کی حفاظت کی ذمّہ داری قبول نہیں کرتا۔ جب تک وہ اس کے متعلقین میں سے نہ ہو۔ سو جب تک اس نے رفعت کو پہچانا نہیں تھا۔ وہ اس کیلئے ایک عام سی لڑکی تھی جس کے ساتھ ایک نوجوان کی چھیڑ خانی پر اُسے اتنا اعتراض ہرگز نہیں تھا کہ وہ عملی طور پر اُسے منع کرنے کی زحمت گوارا کرتا۔ لیکن اب تو صورت حال ہی دوسری تھی۔ رفعت نہ صرف اُس کی بہن کی سہیلی تھی۔ بلکہ ایک حد تک اُس کی پسند بھی تھی۔ جس کے متعلق اُس نے کئی بار سوچا بھی تھا کہ وہ اس کی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ ۔ ۔ ابھی وہ تذبذب ہی میں تھا کہ رفعت اس کے قریب پہنچ گئی وہ بھی اسے پہچان چکی تھی۔

" طارق صاحب یہ نوجوان مجھے تنگ کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ " اُس کی آواز میں خوف، بے چارگی اور غصّہ کے مِلے جُلے آثار تھے۔ طارق کو یکایک ہوش سا آ گیا۔

" کون ہو تم بدتمیز ۔ ۔ ۔ " اُس نے غصّے سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو رفعت کا پیچھا کر رہا تھا۔

"منہ سنبھال کر بات کر اوئے ۔ ۔ ۔ کیا تیری ماں بہن ہے ۔۔؟" مقابل کی آواز میں دھمکی تھی جسے طارق برداشت نہ کر سکا۔

"آپ" یہ ایک زبردست گھونسہ تھا جس نے مقابل کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ طارق نے دو تین زبردست ہاتھ اور لگا دئے۔ وہ باکسنگ کا کھلاڑی رہا تھا۔ اور ایسے لوگوں سے نمٹنے کا فن خوب جانتا تھا۔

"کیا ہوا ۔ ۔ ۔ کیا ہوا" تیس چالیس گز دور کھڑے ہوئے لوگ دوڑ پڑے ۔ یہ سب ملحقہ دفتر کے کلرک بابو تھے اور آنکھیں سینکنے کے موڈ میں تھے لیکن موجودہ صورتِ حال نے انھیں ایک دم مصلح اور لڑکیوں کا محافظ بنا دیا تھا۔

"مارو سالے کو ۔ ۔ ۔ لڑکیوں کو ستاتا ہے ۔"

لیکن "سالے" نے حالات کو بگڑتے دیکھ کر دوڑ لگا دی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ طارق یا کوئی دوسرا اُس تک پہنچے وہ منٹگمری روڈ کا موڑ مڑ چکا تھا۔

پھر مزید کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور اظہارِ تشکر کے طور پر ایک نظر طارق پر ڈال کر وہ اسمبلی ہال کی طرف چل پڑی تھی جہاں سے اُسے نئے روٹ پر چلنے والی بس پکڑنا تھا۔ یہ بس ایک مختصر راستے سے ہو کر سمن آباد جاتی تھی۔ جہاں اُس کا گھر تھا۔ طارق لوگوں کے تعریفی جملوں کو سنتے ہوئے اور دل میں عجیب سی دھڑکن محسوس کرتے ہوئے بیڈن روڈ کی طرف چل پڑا جہاں اُسے اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔

باب ۲

گھر پہنچ کر رفعت بڑی دیر تک اپنے کمرے میں پڑی ہانپتی رہی۔ اُسے چھیڑنے والا نوجوان بہت دن سے اُس پر آوازے کس رہا تھا۔ لیکن اس نے ہمیشہ اُسے ٹال دیا تھا۔ آج اُس نے حد ہی کر دی تھی۔ اگر طارق وہاں نہ ہوتا!

طارق کا نام ذہن میں آتے ہی وہ شرما سی گئی۔ وہ اُس کے سپنوں میں بھی کبھی کبھی انجانے چہرے کی طرح دَر آتا تھا۔ اُس نے دو ایک، بار اُس کے چہرے اور آنکھوں میں اپنے لئے کسی پیام کا اشارہ پڑھا تھا۔ لیکن پھر اُسے اپنی سوچ پر ہی بڑی شرم محسوس ہوئی تھی کیونکہ طارق سب میں بڑا ہی علیحدگی پسند مشہور تھا۔ لڑکیوں سے اُس کا احتراز تو ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا لیکن —

بہرحال اُس نے اپنے اس خیال یا واہمے کو کبھی سنجیدگی سے دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن آج صورتِ حال بڑی مختلف تھی۔ طارق نے اُسے ایک بدمعاش سے بچایا تھا اور یوں اس کی عزت و عصمت کی حفاظت کی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ عورت کی نظروں میں وہی شخص دنیا میں سب سے زیادہ عزت اور محبّت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جو اپنی مردانگی

کے بل پر اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ بھی تو ایک عورت ہی تھی جبھی تو طارق کی اس بہادری پر اُس کا دل جھوم جھوم گیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی آزادی کے راستے میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کا دفاع کرنے والا بھی کوئی موجود ہے۔ کوئی اس کا بھی ہے۔! یہ خیال بڑا ولولہ انگیز اور دل میں ہیجان پیدا کرنیوالا تھا۔ اور اس وقت وہ اسی ہیجان میں گھری ہوئی اپنے پلنگ پر اوندھی لیٹی سپنوں کی مالا پرو رہی تھی۔

"وہ کتنا سُندر ہے، کتنا بہادر ہے اور کس قدر طاقت ور" اُس نے عورتوں کی طرح روائتی انداز میں سوچا اور اُس کے سینے کی دھڑکن کچھ اور بڑھ گئی۔ کاش وہ میرا —!

"چھی چھی —" اُس کے ضمیر نے اُسے لعنت ملامت کی "تم اتنی پاکیزہ کردار کی لڑکی ہو کر اس قدر سستے طریقے سے سوچتی رہی ہو۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہُوا۔ جو اُس نے مجھے ایک غنڈے کے ہاتھوں بے عزت ہونے سے بچایا۔ یہ تو ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے۔ پھر اُس نے کونسی انوکھی بات کی ہے —؟" اُس نے سوچا۔

"لیکن — وہاں اور بھی تو بہت سے لوگ کھڑے تھے — ان میں سے کسی کو اتنی جرأت کیوں نہ ہوئی کہ بڑھ کر اس بدتمیز نوجوان کو ٹوکتا۔" طارق کے حق میں دلائل وزنی تھے۔ اُسے یقین سا آ گیا کہ طارق نے اُس کے لئے جو کچھ کیا وہ صرف طارق ہی کر سکتا تھا کوئی دوسرا نہیں۔

دیر تک بیٹھی وہ اپنے خیالوں کی دُنیا میں کھوئی رہی پھر تھوڑی دیر بعد اُس کی دُوسری بہنیں اور چھوٹا بھائی آگئے جن کی وجہ سے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

طارق اُس شام دیر تک اِدھر اُدھر آوارہ پھرتا رہا۔ دل کی معمولی سی کسک خُدا جانے آج اس قدر تیز کیوں محسوس ہونے لگی تھی۔ رفعت کیلئے اُس کے دل میں پہلے ہی محبت کا ہلکا سا جذبہ موجود تھا۔ لیکن وہ اتنا کمزور تھا۔ جسے سوائے ایک پسند کے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پھر آج تک آمنے سامنے ہوکر گفتگو نہ ہو سکنے کی وجہ سے ایک براہِ راست تعلق پیدا نہیں ہوا تھا جو محبت کی مضبوط کڑیوں کیلئے مسالے کا کام کرتا ہے۔ آج یہ چیز بھی حاصل ہوگئی تھی رفعت نے اسے مخاطب کرکے مدد کی درخواست کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ یہ اس کے لئے کتنا بڑا اعزاز تھا۔ یہ لڑکی تو مدتوں سے اُس سے قطعاً بیگانہ بنی رہی تھی۔ پھر آج اس کا یُوں کھُل جانا اس کو بڑا اچھا لگا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کی مجبوری حائل تھی لیکن وہ بڑا خوش تھا۔ آج اس نے ایک لڑکی کے سامنے اپنی بہادری اور طاقت کا سکہ جما دیا تھا (اُس نے عام مردوں کی طرح سوچا اور بڑا خوش ہُوا۔) وہ لڑکی اس کی پسند بھی تھی اور اب اس براہِ راست تعلق نے محبت کے اُس بیج کو پھوٹنے اور پھلنے پھُولنے کا موقع فراہم کر دیا تھا جو ایک مدت سے دل کے کسی کونے میں پڑا سِسک رہا تھا۔

رات جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تو رفعت کا سُندر اور باوقار سنجیدہ چہرہ

بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش میں بار بار کروٹیں بدلیں مگر نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ اس وقت صُبح کی اذان ہو رہی تھی جب اُس کی آنکھ لگی۔ نیند میں بھی وہ اس کے سامنے تھی۔

رفعت کی اور طارق کی زندگی میں ایک ہلکی سی تبدیلی کے آثار کافی حد تک نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ طارق جب کالج سے فارغ ہوتا تو بجائے دوستوں سے ملنے جلنے یا کافی ہاؤس میں بیٹھ کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے اکیلا اپنے کمرے میں بند رہنے یا لارنس کے کسی الگ تھلگ گوشے میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتا۔ خیالوں میں ہر وقت کسی کی بھولی بھالی معصوم صورت بڑے وقار سے سنجیدگی کے تاثر کے ساتھ موجود رہتی اور وہ اس کے خدوخال میں کھویا کھویا ایک ٹک خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ کالج میں تعلیم کی طرف بھی اُس کی توجہ پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ گھر دیر سے آنے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے والدہ اور بہنوں کے دلوں میں نہ جانے کیا کیا خدشے پیدا ہو گئے تھے۔ صرف ایک دوبار اس سے اتنا ہی پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ تم کچھ بُجھے بُجھے سے رہتے ہو۔۔۔"

"جی کچھ نہیں ۔۔۔ بس پڑھائی کی زیادتی کی وجہ سے مضمحل رہتا ہوں۔"

"اچھا۔ ۔ ۔ ۔ ٹھیک ہے۔"

بات یہیں پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔ وہ بچّوں کے معاملات میں کسی قسم

کی مداخلت کے حق میں ہی نہیں تھے ان کا کہنا تھا کہ بچوں کو آزادی سے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کا موقع دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنی انفرادیت کو ظاہر کر سکیں اور اُن کی نشو نما بہتر انداز سے ہو سکے۔ اگر طارق کے بقول اُس پژمردہ اور بجھے بجھے رہنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ پڑھائی میں بہت زیادہ محنت سے کام لیتا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ قدیر صاحب کو بقول خود ان کے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اُسے محنت کم کرنے اور صحت کا زیادہ خیال رکھنے کے متعلق نصیحت کرتے پھریں۔

لیکن ماں اور بہنوں کا معاملہ اس سے الگ تھا۔ خاص طور پر والدہ، اُسے بے حد چاہتی تھیں۔ اس کی خاموشی اور پژمردگی نے اُن کے دل میں بہت سے شکوک و شبہات پیدا کر دئے تھے۔ سب سے زیادہ اہم شک یہ تھا کہ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ لیکن اگر وہ بیمار ہوتا تو یہ بات یقینی تھی کہ گھر والوں سے ذکر کرتا اور ڈاکٹر سے مشورہ کر کے علاج کرواتا۔ ایسی بھی کوئی بات نہ تھی لے دے کے ایک بات ہی ان کے ذہن میں کھٹکتی تھی وہ یہ کہ کہیں ان کا پیارا بیٹا۔ کسی سے محبّت تو نہیں کرتا ــــ؟

محبّت کے متعلق ان کے تجربات بہت وسیع تھے۔ کیونکہ خود انھوں نے بھی محبّت کی شادی کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ جب کسی کی چاہت کا شعلہ بھڑکنے لگتا ہے۔ تو سنجیدہ طبیعت لوگ اُس کی آگ میں چپکے چپکے سلگتے رہتے ہیں۔ طارق کی سنجیدہ طبیعت کا علم ہر ایک کو اچھی طرح تھا۔ اس لئے اُن کے خیال میں طارق کسی سے محبّت کرنے لگا تھا۔ لیکن وہ کون تھی ــــ؟ اس کا سُراغ

لگانا ذرا مشکل کام تھا۔

بہنوں کو صرف اس معاملے سے اتنی دلچسپی تھی کہ بھیّا ان سے ہنستے بولتے کیوں نہیں۔ ایک روز انھوں نے اُسے رات کے وقت واپسی پر کمرے میں داخل ہوتے وقت پکڑ ہی لیا۔

"بھیّا ..... کہاں سے آرہے ہو ----- ساجدہ نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ وہ اپنے بھائی کی بڑی لاڈلی بہن تھی۔ صفیہ نے آکر اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔

"آج آپ بتا کر ہی بچیں گے کہ آخر اس خاموشی اور اتنی دیر تک گھر سے غیر حاضری کا سبب کیا ہے۔"

"ہٹو ---- اچھی لڑکیوں --- طارق نے ہلکی سی شگفتگی سے کہا --- وہ انھیں ہمیشہ جمع کے صیغے سے "اچھی لڑکیوں" کہہ کر پکارتا تھا اس میں جو تھاہ پیار تھا اس سے وہ دونوں ہی واقف تھیں۔

"جی نہیں ---- آج بغیر بتائے رہائی نہیں ملے گی۔ اس خاموشی کا آخر مطلب کیا ہے۔"

"مطلب وطلب کچھ نہیں۔" طارق نے دونوں کو کھینچتے ہوئے اپنے بستر پر گرا دیا اور ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔

"آج کل عابد ولت بے حد پڑھ رہے ہیں۔ ایم۔ اے میں ٹاپ کرنے کا پروگرام ہے ----" اس نے بزرگانہ اندازِ برتری کے ساتھ اُن کو پچکارتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ کون سی یونیورسٹی ہے جو رات کے وقت بھی کھلی رہتی ہے ۔؟"

صفیہ بڑے تیکھے مزاج کی لڑکی تھی اُس نے سُراغ لگانیوالا طنزیہ انداز اختیار کیا۔

"ہوں —" اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو یہ سوچا جا رہا ہے آج کل میرے متعلق —" وہ سمجھ گیا تھا کہ صفیہ کا اشارہ کس طرف ہے ۔

" دیکھئے ۔ ۔ ۔ یوں نہیں ۔" ساجدہ نے درمیان میں آتے ہوئے کہا۔

" آپ بس ہمیں اتنا بتا دیں کہ آپ ہمیشہ تھکے تھکے اور افسردہ کیوں نظر آتے ہیں ۔"

" بھئی بات یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" طارق جیسے ہار مانتے ہوئے بولا ۔

" ہم چند دوست مل کر ہوسٹل میں اپنے کورس کے متعلق پڑھتے اور بحث و تمحیص کرتے ہیں۔ اس وجہ سے آنے میں دیر ہو جاتی ہے اور تھکا ماندہ معلوم ہوتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اپنی طرف سے اس نے ان کی پوری تسلّی کر دی۔

" ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ساجدہ نے ایک دم صفیہ کی جانب دیکھتے ہوئے طارق کی بات کی تصدیق کی ۔

بھیّا بالکل ٹھیک کہتے ہیں ۔ میری بھی ایک سہیلی ہے بہت ہی پیاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی رفعت نا جو کئی بار ہمارے گھر بھی آ چکی ہے۔ وہ بھی آج کل بڑی تھکی تھکی دکھائی دیتی ہے اور اُس کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ کثرتِ مطالعہ کی شکار ہے ۔ بس یہی حالت بھیّا کی

بھی ہے ۔۔" ساجدہ نے اپنی طرف سے قصہ ہی ختم کر دیا۔ لیکن طارق کا دل دھک سے رہ گیا۔ ساجدہ کے ہونٹوں پر رفعت کا نام آنے سے اُسے اپنے دل کی چوری پکڑے جانے کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔

"اچھا اب چلو بھاگو بیچاری لڑکیوں ۔۔۔ مجھے سونے دو جنم جنم کا تھکا ہارا آیا ہوں۔۔۔۔" اُس نے بہروں جیسے انداز میں منہ بناتے ہوئے کہا اور پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

"اُوئی مری بھیا ۔۔۔۔" ساجدہ چیخی ۔ اُس کا بازو طارق کے کندھے کے نیچے دَب گیا تھا۔

"جاؤ ۔۔۔۔ جاؤ ۔۔۔۔۔ بھاگو ۔" اس نے کندھا ہٹاتے ہوئے کہا۔ چڑیلیں آرام بھی نہیں کرنے دیتیں۔" اس نے مصنوعی لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ خود چڑیلے ۔ بلکہ چڑیلوں کے بھائی ۔" ساجدہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ہات ۔۔۔۔۔ بھاگو ۔۔" طارق نے بناوٹی انداز میں ڈرایا۔ اور وہ بھی بناوٹی انداز میں چیختی ہوئی باہر بھاگ گئیں۔ وہ بھائی کی صفائی پر مطمئن ہو گئی تھیں اور ہر قسم کے خدشات ان کے دلوں سے مٹ چکے تھے اُن کا ایمان تھا کہ اُن کا بھیا اُن سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور نہ ہی اُنھیں اپنے متعلق کسی قسم کے اندھیرے میں رکھ سکتا ہے۔ وقتی طور پر اس کی تھکن اور پژمردگی الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی طارق کے صفائی پیش کرنے سے وہ بالکل مطمئن ہو گئی تھیں وہ بھاگی بھاگی اپنی والدہ

کے پاس گئیں اور انھیں طارق کے متعلق بتانے لگیں کہ کس طرح وہ اس سال خوب ڈٹ کر پڑھ رہا ہے اور ٹاپ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

باب ۳

"تو آج ان بُھتنیوں نے مجھے پکڑ ہی لیا تھا۔" اُس نے پیار اور ڈر کے ملے جُلے انداز میں سوچا۔ رفعت کے نام پر اس نے بڑی مُشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا تھا۔ اور چہرے سے کسی تاثّر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ ورنہ وہ یقینی طور پر پکڑ لیا جاتا۔ اس کی بہنیں بڑی ہشیار اور سمجھ دار تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں اصل راز اگلوا لینا کم از کم صفیہ کے تو دائیں ہاتھ کا کھیل تھا ساجدہ بھی اس معاملے میں کسی طرح پیچھے نہیں تھی۔ لیکن طارق کے معاملے میں وہ اپنی صلاحیتوں سے کوئی کام نہ لے سکتی تھی۔ اسے اپنے بھائی سے بے پناہ پیار تھا۔ اس لئے وہ اُس کی باتوں پر کسی قسم کے شک و شُبہے کے متعلق سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ طارق بھی اُس سے بڑی محبت کرتا تھا اور اکثر اوقات دل کی بات بھی اس کے سامنے ظاہر کر دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا تھا۔ رفعت کا معاملہ ذرا الگ اہمیت کا حامل تھا۔ ایک تو وہ اس بات کو ظاہر کر کے اپنے اپنی بہنوں پر اپنے کردار کے متعلق غلط تاثر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ سکتی تھیں کہ ان کا بھائی ان کی سہیلیوں کو بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اگرچہ بُری اور اچھی کی تمیز ذرا مشکل نہیں۔ محبت کرنا کوئی بُری بات نہیں تھی۔ اور ان کا گھر تو

اس معاملے میں کافی آزاد خیال واقع ہُوا تھا۔ اگر وہ کوئی غیر متعلق لڑکی ہوتی تو وہ کبھی کا اپنے گھر میں اپنی پسند کا اعلان کر چکا ہوتا۔ لیکن یہاں جو مشکل درپیش تھی وہ بہنوں اور خاص طور پر ساجدہ کیلئے مثالی کردار کے نمونے کی تھی۔ اس کی کسی بھی قسم کی لغزش اُنہیں کسی غلط سوچ میں گرفتار کر سکتی تھی جس کے نتیجے میں گھر کی عزت و حرمت مجروح ہو سکتی تھی اور یہ بات اُسے کسی بھی حال میں منظور نہیں تھی۔ اس لئے وہ اپنے اس پاکیزہ جذبے کے جواب ایک تیز بہاؤ والا دریا بن چکا تھا مسلسل دوسروں کی نظروں سے چُھپائے ہُوئے تھا۔

بہنوں سے آج کی گفت گو نے اس کی دہری پریشانی میں کمی کر دی تھی ایک تو وہ اُن کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے اپنے راز کو افشاء ہونے سے صاف صاف بچا گیا تھا اور دُوسرے اُسے پتہ چل گیا تھا کہ رفعت ---- اُس کے خوابوں کی ملکہ رفعت بھی اس کیلئے بے چین تھی۔

ساجدہ نے بتایا تھا کہ آج کل اس کی سہیلی رفعت بھی بڑی پژمردگی دکھائی دیتی ہے جن کا سبب سوائے کثرتِ مطالعہ کے اور کچھ بھی نہیں — لیکن کیا سچ مچ اُس کا سبب یہی تھا؟ اس کے ذہن میں ایک سوال اُبھرا۔

"نہیں ---" اُس کے دھڑکتے ہُوئے دِل نے جواب دیا۔ وہ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے پژمردہ نہیں ہو سکتی۔ یقیناً وہ بھی مجھ سے متاثر ہو چکی ہے ----!!

دل اور دماغ کی ان اُلجھنوں میں وہ بڑی دیر تک پھنسا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آئندہ کیلئے کیا کرے۔ دل کا درد اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا

تھا۔ صبر ممکن تو تھا لیکن بیحد تکلیف دہ اور بہت حد تک پریشان کن ۔ دُوسری طرف اظہار کا معاملہ تھا ۔۔۔۔۔ وہ کس طرح اُس پر اپنے جذبے کا اظہار کرے ۔۔۔۔۔! یہ ایک جان لیوا سوال تھا۔ کس طرح ۔۔۔۔؟ کیسے کہاں۔؟ کیونکر؟ وہ بُرا تو نہیں منائے گی ۔۔۔۔؟ وہ متنفر تو نہیں ہو جائے گی؟ کہیں وہ ساجدؔ کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کر دے۔؟ یہ ایک لفظ "اظہار" کئی لفظوں میں تقسیم ہو جاتا تھا اور ہر سوال اپنی جگہ پر ایک چٹان کی طرح جما کھڑا تھا۔ وہ ان چٹانوں کو تسخیر کرے تو کیونکر ۔۔؟

آخر اس نے دو تین گھنٹے کی کشمکش کے بعد فیصلہ کر ہی لیا۔ یہ فیصلہ درحقیقت اُس کی زندگی اور خاندان کی عزّت کے متعلق بڑا اہم فیصلہ تھا۔ جس کے متضاد اور نہایت دُور رس نتائج نکل سکتے تھے۔ اگر رفعت نے اُس کی محبّت کو قبول کر لیا ۔۔۔ تو پھر شادی کے مراحل کو طے کرنے کے متعلق تدبیریں سوچی جا سکتی ہیں۔ اور اگر اُس نے ٹھکرا دیا تو ۔۔۔۔؟ اس سے نہ صرف اس کی اپنی زندگی تباہ ہونے والی تھی بلکہ گھر کی عزت کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا امکان موجود تھا۔

"پھر ۔۔۔۔۔" اس نے نیند کی وجہ سے آنکھیں موندتے ہوئے سوچا ۔۔۔۔۔!

"میں کل اس سے ملوں گا ۔۔۔۔۔" اس نے ایک ہنگامی فیصلہ اپنے آپکو سُنایا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعصاب کی گھٹن ختم ہو گئی۔ اس کی ذہنی تربیّت ہی اس انداز سے ہوتی تھی۔ ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس پر عمل ایک لازمے کی حیثیت رکھتا تھا اور نتائج ۔۔۔۔۔؟ نتائج کے بارے میں پہلے سوچ کر ہی

وہ کیسی کا بات کا فیصلہ کرتا تھا۔

دُوسرے دن وہ جب گھر سے نِکلا تو اس کے جسم میں ہلکی سی تھرتھری تھی۔ کئی شکوک وشبہات اور واہمے اس کے دل کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔ لیکن اس نے اُنھیں جھٹک دیا۔ وہ ارادے کا بڑا پکا تھا۔ اور دل میں جس بات کا ارادہ کر لیتا تھا اُس سے کبھی نہ پھرتا تھا۔

کلاسوں کے درمیان بھی وہ پُوری توجہ سے لیکچر نہ سُن سکا جیسا کہ اس کا معمول تھا لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے سے کسی غیر معمولی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ایک بجے جب اس کا آخری پیریڈ ختم ہوا تو اس نے باہر جانے میں جلدی کی۔ اُس کے دوست توقیر نے اس کو پیچھے سے آواز دی۔

"کیا بات ہے طارق۔۔۔ آج بھاگے چلے جا رہے ہو۔۔۔؟"

"کچھ نہیں یار۔۔۔۔ مجھے ایک ضروری کام کی وجہ سے ایک جگہ پہنچنا ہے۔۔۔!!

"خیریت تو ہے نا۔!"

"خیریت۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ بالکل" تیزی سے کہتا ہُوا وہ مین گیٹ سے باہر نِکل گیا۔ سڑک پر آ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ میلوں بھاگتا آیا ہے۔ اس وقت اس کی منزل رفعت کا کالج تھی۔۔۔۔ رفعت جو اُسکی منزل تھی۔ حقیقی اور دائمی منزل۔ آج اس کی چاہت کا فیصلہ ہونا تھا۔ ایک بار پھر اُس نے اپنا دل بیٹھتا ہُوا محسوس کیا۔ لیکن اسی وقت سامنے سے ایک ٹیکسی

آتی ہوئی دکھائی دی۔

اُس نے اضطراری طور پر ہاتھ کھڑا کر دیا۔ گاڑی رُک گئی۔

"کہاں چلئے گا ——؟" ڈرائیور نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

"اسمبلی ہال ——" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور جسم پسینے سے شرابور —— جیسے وہ اسمبلی ہال کو آگ لگانے جا رہا ہو۔

"بیٹھئے ——" ڈرائیور کی آواز نے اُسے ڈھارس دی۔ وہ پچھلی سیٹ میں دھنس گیا۔ پسینے سے بُرا حال تھا۔ ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کر کے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ طارق اس وقت چونکا جب ڈرائیور کی آواز اس نے سُنی۔

"کیا بات ہے بابو صاحب —— آپ اسمبلی ہال کے پاس پہنچ گئے ہیں۔"

وہ اپنی محویت پر جھینپ سا گیا۔

"ایک روپیہ دس پیسے ——" میٹر بتا رہا تھا۔ اُس نے بٹوا کھولا۔ روپے روپے کے دو نوٹ نکالے۔ اُس نے ڈرائیور کی طرف بڑھا دئے۔

"ریزگاری نہیں ہے میرے پاس ——"

"رکھو ——" نوٹ تقریباً گاڑی کے اندر پھینکتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا ڈرائیور ہکا بکا ہو کر اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔ جو دس پیسے کے بدلے اُسے ایک روپیہ دے گیا تھا۔

ہیلتھ ڈائرکٹوریٹ کے قریب ایک چھدرے درخت کے نیچے ستمبر کی دوپہر میں کھڑے کھڑے اس نے محسوس کیا کہ جیسے صدیاں بیت گئی ہیں۔ رفعت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اُس نے پریشان ہو کر سوچا۔

" وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ "

پھر وہ اپنی اس سوچ پر شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے کون سا آنے کا وعدہ کیا تھا۔

" ممکن ہے اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو کہ کوئی اس کے انتظار میں ایک ایک پل گِن گِن کر گزار رہا ہے ——" اس نے سوچا اور مایوسی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے جسم کو ٹھنڈا کر گئی لیکن —— اس نے سامنے نظریں اٹھائیں۔ —— وہ کالج کے گیٹ سے نکل کر اسی جانب سڑک کے ساتھ ساتھ چلی آرہی تھی جس جانب وہ کھڑا تھا۔ اس کے جسم کے روئیں تن گئے خون چہرے پر کھنچ آیا جس کی وجہ سے اس کا خوبصورت سفید رنگ چہرہ بالکل گلنار معلوم ہونے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتی آرہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ایسے رُخ کر لیا کہ وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ اب وہ اس کے برابر سے گزر رہی تھی۔

" رفعت جی ——" اس کے ہونٹوں سے لرزتی ہوئی صدا نکلی اس نے مُڑ کر دیکھا۔

وہ اس کے سامنے نظریں جھکائے خاموش کھڑا تھا۔

بہت کم لڑکیوں کی زندگی میں ایسا واقعہ رُونما ہوتا ہے کہ جسے وہ چوری چوری —— چپکے چپکے ساری دُنیا سے چھُپ کر پیار کرتی ہوں وہ اس طرح ان کے سامنے سراپا التجا بن کر آکھڑا ہوا۔! وہ کتنی خوش قسمت لڑکی تھی۔

" جی —— فرمائیے" —— اس نے سنبھل کر کہا۔ محبت کی آگ جسم میں شرارے بھرتی چلی جا رہی تھی ——

"میں ——— کچھ کہنا چاہتا ہوں" ——— اس نے پہلے ہی کی طرح کھڑے کھڑے کہا۔ آواز گھٹی گھٹی تھی۔

رفعت سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کا دل جھوم اُٹھا ——— جی چاہا کہ یہیں ——— اسی سڑک پر ——— اس دھوپ میں کھڑے ہوئے وہ اپنے من کے دیوتا کے چرنوں میں سجدے کے لئے جھک جائے ——— لیکن ———

اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا ——— اِکّا دُکّا لڑکیاں اور لوگ آجا رہے تھے لیکن کسی نے اُن کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

"میرے ساتھ آئیے ———" اُس نے بڑی ہمت سے کام لے کر کہا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی مرد سے اس طرح ہم کلام ہو رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ کی طرح اس کے ساتھ ہو لیا۔ رفعت کا رُخ اسمبلی ہال کی طرف تھا۔

"ٹیکسی لے لیں" ——— چند قدم آگے جا کر طارق نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ مُنہ سے یہ لفظ نکالنے کے بعد اُسے اپنی قوت واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس نے سڑک پر جاتی ہوئی خالی ٹیکسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ رُک گئی۔

"چلئے ———"

وہ چُپ چاپ اس کے پیچھے ہو لی۔ ٹیکسی میں وہ چُپ چاپ ایک دُوسرے کے ساتھ بیٹھے رہے۔

"کہاں ———" ڈرائیور نے کنکھیوں سے ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نیشنل ہوٹل ———" طارق نے بتایا۔ وہ اب پوری طرح سنبھل چکا

تھا اور صورتِ حال کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ نیشنل کیفے کا مالک اُس کا ایک بہت اچھا دوست تھا جس کی طرف سے ہر ممکن سہولت ملنے کی اُمید تھی۔ اُس نے دونوں کے لئے اپنا خاص کمرہ کھول دیا اور باہر چلا گیا۔

وہ دونوں جو سنجیدہ اور پڑھے لکھے تھے۔ جنہیں خود پر قابو بھی تھا اور اپنے گھروں کی عزت و حرمت کا پورا احساس بھی —— اس وقت ایک ہوٹل کے کمرے میں ایک دُوسرے کے سامنے حیران کھڑے تھے اور چُپ تھے۔

—— دونوں ٹکٹکی باندھ کر ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ اُن کے چہروں کی رنگت پیلی پڑتی جا رہی تھی، انھوں نے کبھی ایک دُوسرے کے فوری طور پر اس قدر قریب آجانے کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے تیار بھی نہ تھے۔ لیکن وہ ایک دُوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ اور یہ بات اُن کے دِلوں میں اعتماد پیدا کر رہی تھی۔ محبت کبھی نہیں بھٹکتی —— وہ ہمیشہ اپنی عزت و حرمت کی پاسبانی کرتی ہے۔

—— دونوں نے سوچا اور درد کی ایک تیز لہر اُن کے دِلوں میں دوڑ گئی ——

رفعت ——

طارق ——

دیر تک وہ کمرے کے درمیان ایک دُوسرے سے لپٹے ہوئے سسکیاں بھرتے رہے۔ خاموش محبت بہت آگے بڑھ گئی تھی اور اُس نے پہلی ملاقات پر تمام حجابات کو توڑ دیا تھا۔

باب ۴

محبت ایک بہت ہی عجیب جذبہ ہے جس کے ساتھ ہزاروں کیفیات وابستہ ہیں۔ اس کے تاثرات بھی بے شمار ہیں۔ کبھی یہ آدمی کو بالکل ناکارہ اور عضوِ معطل بنا دیتی ہے اور کبھی زندگی کی اعلےٰ ترین منزلوں کی طرف گامزن کر دیتی ہے طارق اور رفعت کو ایک دوسرے سے سچا پیار تھا۔ دونوں اپنے اپنے مزاج میں، سنجیدہ ہونے کے علاوہ باہوش اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ محبت نے بجائے اُنھیں جذبات کا پیکر بنا دینے کے ایک نئی کھال میں ڈھال دیا تھا۔ یہ اُن کی چھٹی ساتویں ہی ملاقات تھی۔ طارق نے نیشنل ہوٹل کے ایک کمرے میں صوفے پر بیٹھے ہوئے بیرے کو بُلانے کیلئے بیل دی اور رفعت کو دیکھنے لگا جو سامنے صوفے پر بیٹھ چکی تھی اور اپنا پرس کھول کر ایک کتاب کو اُلٹ پلٹ رہی تھی ——

"کیسے مزاج ہیں" —— طارق نے محبت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا

"ٹھیک ہیں" —— رفعت شرمائی شرمائی سی تھی۔ ابھی تک اُس کا حجاب مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔

"آپ کچھ" —— لفظ ابھی طارق کے ہونٹوں ہی میں تھے کہ بیرے نے دستک دی۔ طارق نے اُسے بلا کر کچھ مشروبات لانے کا کہا اور اطمینان سے

ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ آپ کچھ پریشان دکھائی دیتی ہیں۔" اُس نے سلسلۂ کلام کو دوبارہ شروع کیا۔

"جی نہیں ــــــ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پھر یہ جھجک اور شرم میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بس ایسے ہی ــــــ رفعت نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ اب طارق کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو پرکھنے میں لگے رہے۔

"دیکھو رفعت" ــــــ طارق نے بے تکلفی کا سہارا لیتے ہوئے بات شروع کی۔

"مجھے تم جانتی ہو ــــــ میں کیسا ہوں ــــــ کیسا مشہور ہوں اور میرے گھر کے حالات کس طرح کے ہیں تمہیں ان چیزوں کے متعلق پوری واقفیت حاصل ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔"

"یقیناً ــــــ میں آپ کے متعلق سب باتیں جانتی ہوں۔" رفعت نے قدرے بیباکی سے کہا۔ وہ اب گفت میں اپنے روائتی ضبط سے کام لے کر اپنی بے چینی اور اضطراب کو چھپا چکی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان ایسا تعلق قائم ہو جس میں ایک دوسرے سے گہری شناسائی اور واقفیت کا عنصر بھی شامل ہو۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"جی ہاں ــــــ آپ درست فرما رہے ہیں۔"

"تمہارے دل میں میرے لئے جو پیار ہے میں اُس سے آگاہ ہوں اور خود کو اس پر دُنیا کا خوش قسمت ترین فرد سمجھتا ہوں اس کے ساتھ ہی میری یہ خواہش بھی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایک ایسے بندھن میں بندھے ہوئے ہوں جس میں کسی قسم کی غلط فہمی اور پریشان فکری کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اس طریقے سے ہم مطمئن رہ کر پیار کی کامیابی کے لئے جد وجہد کر سکتے ہیں —— میری باتوں سے تم بور تو نہیں ہو رہی ہو ——"

"جی نہیں ——" رفعت نے محویت سے نکل کر جواب دیا۔ وہ طارق کی گفت کے گہرے پانیوں میں غرق تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اس کا محبوب کتنا سُلجھا ہوا فرد ہے۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے جذبات کو اپنی عملی زندگیوں کے آڑے نہ آنے دیں ——" طارق نے بات دوبارہ شروع کی۔

"مثال کے طور پر میں ایم۔ اے کا طالب علم ہوں۔ میری ذات سے میرے اُستادوں دوستوں اور گھر والوں کو بہت سی توقعات ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوں گا اور امتیازی پوزیشن حاصل کروں گا۔

لیکن میں جب سے تم سے لگاؤ محسوس کرنے لگا ہوں اس وقت کے دوران، ایک لمحے کیلئے بھی مکمل طور پر تعلیمی سرگرمیوں کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے تم بھی اس صورتِ حال سے دوچار رہی ہو" —— طارق نے سوالیہ نظروں سے رفعت کی طرف دیکھ کر کہا۔ رفعت شرما سی گئی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کی پریشان حالی کی خبر اسی کی سہیلی ساجدہ کی زبانی طارق پر واضح ہو چکی

ہے۔

"آپ کو اس بات کا علم کیسے ہُوا ——" رفعت نے جھجکتے ہُوئے پوچھا۔ طارق مسکرا دیا۔

"بھئی یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ آخر معلومات حاصل کرنے کیلئے میرے کچھ خفیہ ذرائع بھی ہیں" —— طارق نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"بہرحال آپ بجا کہہ رہے ہیں" —— رفعت نے اقرار کیا۔

"یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب تک وہ اپنی کسی خلش کو مٹا نہ لے اُسے کسی صورت چین نہیں آتا اور نہ وہ دوسرے معاملات پر کماحقہ توجہ دے سکتا ہے۔ میں نے بھی ایک طویل عرصے تک آپ کیلئے دل میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کی ہے" —— رفعت ایک لمحے کے لئے رُک گئی —— شاید کچھ حجاب مانع تھا طارق انہماک سے اُس کی طرف متوجہ تھا۔

"اس عرصے کے دوران —— اس نے دوبارہ بات شروع کی ——

"میں پڑھائی کی طرف کسی طرح توجہ نہ دے سکی اور نہ ہی دوسری دلچسپیوں کی جانب مکمل توجہ دے سکی۔ میرے گھر والوں اور سہیلیوں کو اس بات کا بڑا تعجب تھا کہ میں پژمردہ اور تھکی تھکی خیالوں میں کھوئی ہوئی کیوں معلوم ہوتی ہوں۔ لیکن میں اُن کے سامنے اپنے دل کی بات ظاہر نہ کر سکی —— کر ہی نہیں سکتی تھی" —— اُس نے محبت سے طارق کی طرف دیکھا —— طارق کی آنکھوں میں بالواسطہ اظہارِ محبت کیلئے اظہارِ تشکر تھا۔

"بالکل یہی کیفیت میری رہی" —— اس نے رفعت کی تائید کی۔

"لیکن اب —— جبکہ ہم ایک دوسرے کو پا چکے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ایک رہنے کے عہد و پیمان کر چکے ہیں میرا خیال ہے کہ ہم آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل طے کر لیں۔ تاکہ ہماری زندگی کی دیگر مصروفیات کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے ——"

"یہ بات بالکل درست ہے" —— رفعت نے تائید کی —— "تو پھر آؤ —— مِل جُل کر کوئی ایسے طریقے اختیار کر لیں کہ ہم ایک دوسرے سے ملتے بھی رہیں —— مستقبل کیلئے ایک دوسرے کے حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھیں اور اپنی موجودہ تعلیمی سرگرمیوں کی طرف بھی پوری توجہ دے سکیں۔"

—— "یہ ہونا چاہیئے ——"

"تو پھر چلو اس بات کا عہد کریں۔ کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ کبھی ایک دوسرے سے خفا نہیں ہوں گے۔ ایک دوسرے سے باقاعدگی کے ساتھ ملتے رہیں گے اور بڑی مستعدی کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی طرف توجہ دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو ہمیشہ کیلئے اپنانے کی خاطر اپنے اپنے گھروں میں ماحول کو ہموار کرنے کی کوشش کریں گے" —— طارق نے جذبات میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب طمانیت اور زندگی کا احساس تھا۔

دیر تک اکٹھے بیٹھے آئندہ زندگی کا پروگرام مرتب کرتے رہے۔ اُنھیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دو ایسے مرد اور عورت ہیں۔ جنھیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں۔ وہ کہن سالہ میاں بیوی کی طرح گفتگو میں مصروف تھے۔

شام سے کچھ دیر پہلے وہ دونوں ہوٹل سے اُٹھ گئے اور گنگا رام کے قریب ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ تاکہ الگ الگ سمن آباد پہنچیں تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔

باب ۵

"کیا بات ہے بھئی —— کیا تم لوگوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی وقت پر باہر نہیں نکلو گے" —— قدیر صاحب نے غصیلی آواز میں کہا۔ "کب سے چلا رہا ہوں —— فلم کا وقت نکلا جا رہا ہے ——"

بے چینی اور اضطراب ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پارے کی طرح بے تاب رہتے ایک پل بھی آرام سے بیٹھنا اُن کے لئے مشکل ہوتا تھا۔ خاص طور پر انتظار کرنا تو اُن کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔

وہ شہر کے بہت بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ موٹر سپیئر مارٹ کے ڈیلر تھے۔ کئی مشہور و مقبول گاڑیوں کے فالتو پرزوں کی ایجنسیاں اُن کے پاس تھیں۔ جن سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ تعلقات بھی خاصے وسیع تھے اور شہر کے معزز لوگوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ عُمر کے لحاظ سے وہ پچاس سے اُوپر ہو گئے لیکن دیکھنے میں چالیس سے زیادہ کے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ جب روزگار کی آسانی ہو۔ کاروبار چل رہا ہو اور آنے جانے کیلیے دو دو کاریں ہوں نیک بیوی اور سمجھ دار اولاد ہو تو پھر بڑھاپا آدمی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ یہی کیفیت قدیر صاحب کی تھی۔ جو اس وقت بے چینی کا

مرقع بنے ہوئے تھے۔

"تو یہ ہے ـــــ آپ تو بچّوں کی طرح شور مچا رہے ہیں" بیگم قدیر نے دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھتے ہوئے انھیں دیکھ کر کہا۔ وہ لمبے قد اور سڈول جسم والی ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ چہرہ کتابی اور اس پر موٹی موٹی بڑی آنکھیں شباب میں اُن کے لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہونے کی چغلی کھاتی تھیں۔ چہرے پر ایک تقدّس سا چھایا ہُوا تھا۔ جس سے ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اُن کے سکون اور پاکیزگی کا پتہ چلتا تھا۔ اپنے خاوند سے ان کی محبت کے قصّے خاندان کی حدود کو پھاند کر ملنے جُلنے والوں تک بھی پہنچ چکے تھے۔ جوانی میں جب اُن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ پیار سے انھیں منکہ بیگم کہہ کر پکارا کرتے تھے اس وقت سے منکہ بیگم ہی ان کا نام بن گیا تھا۔ حالانکہ والدین نے ان کا نام فوزیہ رکھا تھا۔

"اللہ عورتوں کے میک اپ سے بچائے ـــ چاہیں تو اس شغل میں دن رات ایک کر دیں ـــــ" قدیر صاحب نے چُٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ تو بلا وجہ بگڑ رہے ہیں ـــــــ"

"ہش ـــــ بگڑ وگڑ نہیں رہا ـــــ" قدیر صاحب نے بیگم کی بات کاٹتے ہوئے کہا" چلو بیٹھو گاڑی میں ـــ"

اتنے میں ان کی دونوں صاحبزادیاں بھی اپنے کمروں سے باہر آگئیں۔

"دیکھئے ابّا جان آپ کی وجہ سے جلدی آگئے ہیں ورنہ ابھی بال بنانے باقی تھے ـــ" ساجدہ نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

صفیہ حسبِ معمول خاموش تھی ـــــ

"تم لوگوں کے بال بنانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن پھر ہم وقت پر سینما نہیں پہنچ سکیں گے ـــــ"

"آپ تو یونہی گھبرا رہے ہیں ڈیڈی ـــــ ابھی تو صرف چھ بجے ہیں" صفیہ نے دھیرے سے کہا۔ وہ ساجدہ سے بڑی تھی۔

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اُس وقت روانہ ہونا چاہئیے جب فلم شروع ہو چکی ہو ـــــ" قدیر صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا۔ دونوں لڑکیاں چپ رہیں وہ اپنے ابّا کی باتوں کی تردید بہت کم کیا کرتی تھیں۔

راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ سینما کے قریب کار کو پارک سائڈ کی طرف موڑتے ہوئے اچانک قدیر صاحب کی زبان سے نِکلا۔

" ارے ـــــ یہ طارق کدھر گھوم رہا ہے ـــــ" طارق اُن کا بیٹا تھا۔

"کہاں" ـــــ بیگم صاحبہ نے چونک کر دریافت کیا۔

" اُدھر" ـــــ قدیر صاحب نے اشارے سے بتایا۔

سبھی اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک خوش پوش اور قبولِ صورت نوجوان ایک لڑکی کے ساتھ سینما کے پاس سے گزر رہے تھے۔ اُس نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔

" یہ لڑکی نہ جانے کون ہے" ـــــ قدیر صاحب استفسارانہ انداز سے بولے۔

"آپ تو یوں پوچھ رہے ہیں جیسے ہم اِسے جانتے ہوں"۔ بیگم کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔ ساجدہ اور صفیہ ایک دُوسرے کا منہ تک رہی تھیں۔

"بیگم ــــ تم تو کہا کرتی تھیں کہ طارق ــــ"

"بس بس میرے سامنے اس کا نام نہ لو ــــ اس نے میرے اعتماد کو وہ ٹھیس پہنچائی ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتی" ــــ اُن کی آواز غصّے کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔

"تم تو سچ مُچ غصّے میں آگئیں ــــ یہ بات ٹھیک نہیں ــــ ہوگی کوئی دوست ووست" قدیر صاحب نے بیگم کو نرم کرنے کی کوشش کی۔

"رہنے دیجئے ــــ آج یہ گھر تو آئے ــــ میں"

"امّی جان آپ خفا کس لئے ہوتی ہیں ــــ ممکن ہے وہ بھیّا کی کوئی کلاس فیلو ہو" ــــ ساجدہ نے بھائی کی وکالت کی۔

"تم چُپ رہو ــــ بیگم پھنکاریں ــــ "میں سب سمجھتی ہوں۔ میں جب اس کی شادی کا ذکر چھیڑتی ہوں تو یہ ٹال جاتا ہے ــــ کبھی ادھوری تعلیم کا بہانہ ــــ کبھی عمر کا حوالہ ــــ کبھی آئیں۔ بائیں۔ شائیں.. آج پتا چلا ہے کہ یہ سب ٹال مٹول اس کلموہی کیلئے کر رہا ہے۔"

"لو اور سُنو" ــــ قدیر صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے گاڑی کو پارکنگ شیڈ میں روکا ــــ "اتنی پیاری بہو چُنی ہے تمہارے لال نے اور تم اُسے کلموہی کہہ رہی ہو ــــ کوئی اپنی ہونے والی بہو کو ایسے بھی پکارتا ہے"

"آپ بات کو مذاق میں مت ٹالیں" بیگم نے غصیلی آواز میں کہا۔

"ابو—فی الحال اس موضوع کو رہنے دیجئے۔ فلم کا مزا کرکرا ہو جائے گا"
—ساجدہ نے کہا۔

"اچھا—صرف اتنا بتا دو کہ تم دونوں کو اپنی بھابی پسند بھی ہے کہ نہیں"—قدیر صاحب نے چھیڑنے والے انداز سے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے ساجدہ اور صفیہ سے پوچھا۔

"میں نے تو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں"—صفیہ نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ وہ ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی خاموش رہ کر اپنے ابا کی طبیعت کو مکدّر کرنا چاہتی تھی۔

"مجھے تو بہت پسند آئی ہے"—ساجدہ پکار اُٹھی۔

"جان نہ پہچان"—بیگم نے اُسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا
"—رہنے دو اپنی تعریفیں—بڑی آئیں بھابی کی قصیدہ خواں"

"ارے واہ بیگم—تم نے تو حد ہی کر دی" قدیر صاحب نے گاڑی لاک کرتے ہوئے کہا "نجانے وہ کون ہے—اور تم ابھی سے اُسے اپنی بہو تصوّر کر بیٹھی ہو—خوامخواہ اچھا بھلا موڈ برباد کر رہی ہو—"

بیگم صاحبہ نے سر جھکالیا۔ قدیر صاحب نے بوکس ریزرو کروالیا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ جلد ہی اپنی سیٹوں پر بیٹھے تجارتی اشتہارات دیکھ رہے تھے جو فلم شروع ہونے سے پہلے دکھائے جاتے ہیں۔

فلم شروع ہوگئی۔ بیگم قدیر اپنے ہی خیالوں میں گم تھیں اُن کو فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب بھی اپنے خیالوں سے چونکتیں اپر وہ سکرین پر ایک

نظر ڈال لیتیں۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا اور انٹرول ہوگیا ہال کی بتیاں جلنے لگیں اور چھابڑی والے آوازیں لگانے لگے۔ قدیر صاحب نے ساتھ والی سیٹ پر اپنی بیگم کو دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں۔

"ذرا اپنی امّی کو دیکھو ــــــــ" قدیر صاحب نے ساجدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ارے ــــــ امّی تو سو رہی ہیں" ساجدہ نے بے ساختگی سے کہا۔

اُس کا یہ فقرہ سُن کر صفیہ نے بھی مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"بیگم کیا بات ہے" ــــــ قدیر صاحب نے انھیں کندھے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں" ــــــ اُنھوں نے جاگ کر کہا۔

"کیا نیند آگئی تھی۔؟"

"نہیں تو ــــــــ"

اس بات پر لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اچھا پھر یہ بتاؤ انٹرول ہوتے وقت کیا ہو رہا تھا؟"

"اس وقت ... طارق"

"لاحول ولا ... تو تم ابھی تک انھیں خیالوں میں غرق ہو" قدیر صاحب نے چائے والے کو چائے لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"امّی کو نجانے ایک دم یہ کیا ہوگیا ہے ....." ساجدہ نے صفیہ سے سرگوشی کی۔

"امّی بڑی حساس ہیں۔ طارق بھائی کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ آج بھیّا کی خیر نہیں۔" صفیہ نے خدشے کا اظہار کیا۔

"میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ آخر طارق بھیّا نے ایسی کونسی نئی بات کی ہے۔ جو اس سے پہلے اس دنیا میں نہ ہو چکی ہو۔ ہزاروں ماؤں کے بیٹے اس دنیا میں اپنی مرضی سے شادی کرتے ہیں۔ لیکن کوئی بُرا نہیں مانتا۔ ہماری امّی کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔ جو ابّا جان کی طرح بھیّا پر بھی حکم چلانا چاہتی ہیں۔ جوان اولاد کی اپنی مرضی بھی ہوتی ہے اور والدین کو اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ وہ زمانے گئے جب۔۔۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔" صفیہ نے ساجدہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"باجی میری باتیں اتنی اچنبھے میں ڈالنی والی نہیں ہیں۔ ہر شخص آزادی چاہتا ہے۔ لیکن دُوسروں کی آزادی اُسے کھٹکتی ہے۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ آپ بھی یہی چاہتی ہوں گی کہ آپ کی شادی۔۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔۔۔۔" صفیہ نے غصیلے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"سچی باتیں تلخ ہوتی ہیں۔۔۔۔" ساجدہ نے لاپرواہی سے کہہ کر مُنہ پھیر لیا۔

"کیا بحث ہو رہی ہے"۔۔۔ قدیر صاحب نے لڑکیوں کو تیز تیز باتیں کرتے دیکھ کر کہا۔

"ابّا جان فلم پر بحث ہو رہی ہے۔۔۔" ساجدہ نے بات بنائی "باجی

کہتی ہیں کہ انھیں ہیرو کا کام پسند نہیں آیا۔"

"میرے خیال میں تو وہ اپنے رول کو خوب نبھا رہا ہے۔"

اتنے میں چائے آگئی اور وہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے کچھ دیر بعد فلم دوبارہ شروع ہو گئی۔ اب بیگم صاحبہ بھی پوری دلچسپی سے فلم دیکھ رہی تھیں۔

باب ۶

گھر پہنچے تو طارق پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آج اُسے رنگے ہاتھوں دیکھا جا چکا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش و خرم تھا اور چہرے پر تازگی کھیل رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے دھویں کو چھلّوں کی صورت میں فضا میں بکھیر رہا تھا۔ سب لوگ سیدھے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ طارق انھیں دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"السلام و علیکم" اُس نے بچّوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"وعلیکم السلام" قدیر صاحب نے بزرگانہ انداز میں جواب دیا آواز میں کوئی خاص بات تھی جس نے طارق کو چونکا دیا۔ اُس نے دیکھا، سب لوگوں کے چہروں پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی جو ایک خلافِ توقع بات تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگ کوئی انتہائی ڈراونی فلم دیکھ کر آرہے ہیں" اس نے جھجکتے ہوئے سوال اُٹھایا۔

"کیوں ------" ساجدہ نے پوچھا۔

"اس لئے کہ آپ لوگوں کے چہروں پر ابھی تک خوف اور سنجیدگی کے آثار باقی ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کوئی بے حد المیہ فلم دیکھ لی ہے۔"

"اس سنجیدگی کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔" صفیہ نے مبہم لہجے میں کہا وہ اپنی امی اور ابا کو خاموشی سے کھڑے دیکھ رہی تھی۔

"خدا نہ کرے جو اس کے علاوہ کوئی وجہ ہو،" طارق نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"بھئی بیٹھ تو جاؤ ......" قدیر صاحب نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ وہ دھم سے صوفے میں دھنس گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی بیٹھ گئے۔

"بھائی جان ...... آج ہم نے آپکو دیکھا تھا..." ساجدہ نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"کہاں ...."

"الفلاح سینما کے قریب"

"اچھا ......" اس نے حیران ہو کر کہا۔ سارا معاملہ اُس کی سمجھ میں آ گیا۔

"تمہاری والدہ صاحبہ کو تمہاری وہ حرکت پسند نہیں آئی ..." قدیر صاحب نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو آپ سب لوگ اسی وجہ سے اتنے سنجیدہ نظر آرہے ہیں"

"ہاں ...... فیضان کی امی نے کہا۔ "کون تھی وہ چھنال۔ جس کے ساتھ تم جا رہے تھے ......" ان کی آواز میں غصہ تھا۔

"امی کسی کی غیر موجودگی میں اسے گالیاں دینا کہاں تک درست ہے۔"

ساجدہ نے دخل دیا۔۔۔ اُسے اپنی امّی کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"دیکھ لیا آپ نے ۔۔۔۔۔ بھائی کی طرفداری ہو رہی ہے۔" بیگم صاحبہ نے خاوند کی طرف دیکھ کر کہا۔ ساجدہ گھبرا سی گئی۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ یہی بات شریفانہ طریقے سے بھی پوچھی جا سکتی تھی۔۔۔۔" قدیر صاحب نے بیٹی کی حمایت کی۔

"آپ در پردہ طارق کو شہ دے رہے ہیں ۔۔۔۔" بیگم صاحبہ نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہم تو سچی بات کہیں گے۔ اگر تم بُرا مانو گی تو تمہاری مرضی۔"

"دیکھا ہوا ہے آپ کا سچ ۔۔۔"

"امّی جان آپ اباجی سے خواہ مخواہ ناراض نہ ہوں۔ وہ لڑکی میری دوست ہے۔ ہم مال روڈ پر سیر کر رہے تھے۔ آپکو اس پر کیا اعتراض ہے ۔۔۔۔" طارق نے بات کا رُخ اپنی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"شریف لڑکیاں غیر لڑکوں کے ساتھ اس طرح کھُلے بندوں سیر نہیں کرتی پھرتیں۔۔ وہ بے حیا کون ۔۔۔۔؟"

"امّی جان وہ آپ جیسی ہی باحیا لڑکی ہے ۔۔۔"

"خاموش کمینے، ذلیل، مجھے اُس سے ملا رہا ہے ۔۔۔" بیگم صاحبہ پوری طرح بھڑک اُٹھیں۔ دونوں لڑکیاں چُپ تھیں۔ صفیہ نے ماں کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"بھیّا کچھ تو خیال کریں ۔۔۔ ماں کے پاؤں کے نیچے جنّت ہوتی ہے

اور آپ ماں کو ـ ـ ـ ـ ـ"

"باجی آپ بات کو بڑھانے کی کوشش نہ کریں" ساجدہ نے صفیہ کی بات کاٹی۔

"تم چپ رہو" ـ ـ ـ صفیہ نے غصّے سے کہا

"میں چپ نہیں رہوں گی۔"

"تم بھیا کی آڑ لے کر اپنے لئے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میں تمہارا مطلب خوب سمجھتی ہوں ـ ـ ـ ـ" صفیہ نے ساجدہ پر چوٹ کی۔

اگر تم یہی سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو۔ میں ایسی اوٹ پٹانگ باتوں سے ڈرنے والی نہیں" ساجدہ نے قدرے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں تم کیوں ڈرو گی ـ ـ ـ" صفیہ نے اُسے تاؤ دلایا۔

"یہ کیا تماشا ہو رہا ہے ـ ـ ـ" قدیر صاحب نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "پہلا جھگڑا ختم ہونے سے پہلے ہی تم لوگوں نے اپنی لڑائی شروع کر دی"

طارق شش و پنج میں پڑا ہُوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو وہ کیسے سلجھائے۔ اپنی بات پر اڑتا ہے تو ماں ناراض ہوتی ہے اگر ماں کی بات مانتا ہے تو اپنی پسند سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

رفعت جو اس مسئلے کی بنیاد ہے، اسے خبر بھی نہ تھی کہ صرف اسکی ذات کی وجہ سے ایک کنبے کے افراد کے درمیان بیگانگی اور نفرت کی دیواریں چنی جا رہی ہیں۔

"اگر میں نے اس وقت اپنے مؤقف سے قدم پیچھے ہٹالئے۔ تو رفعت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لہٰذا آج ہی یہ بات منا کر چھوڑنی چاہیئے۔۔" اس نے سوچا اور یوں بات چلائی۔

"امّی جان کیا آپ یہ نہیں چاہتیں کہ آپ کا بیٹا خوش و خرم نظر آئے۔"

"تم ماں باپ کی پسند و ناپسند کا مسئلہ بالکل اُڑا رہے ہو۔" بیگم صاحبہ نے تیکھے انداز میں گول مول بات کہی۔

"ہر گز نہیں —"

"اگر تم سچے دل سے یہ بات کہہ رہے ہو تو پھر میری بات مانو۔ اس لڑکی سے آئندہ کبھی نہ ملو۔ تمہارے لئے مجھے دُلہن کا انتخاب کرنا ہے۔۔۔"

"لیکن آخر کیوں ۔۔۔۔۔ اس لڑکی نے کب آپ کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے جو آپ اُس کے خلاف ہو رہی ہیں۔۔۔۔؟"

"یہی کیا کم ہے کہ اُس نے تمہیں میری باتوں کے خلاف بولنے پر آمادہ کرلیا ہے۔۔"

"بالکل نہیں۔ میں اب بھی آپ کا اتنا ہی تابعِ فرمان ہوں جتنا اس سے پہلے تھا۔"

"تو پھر تم میرا حکم ماننے سے انکار کیوں کرتے ہو۔۔؟" انھوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"امّی مجھے اس لڑکی سے ۔۔۔۔۔۔" وہ گھگھیایا۔

"محبت ہے ـ ـ ـ ـ ـ" قدیر صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ اتنے ہی کھلے دل سے بات کرتے تھے۔

"آپ بیٹے کی طرفداری بند کریں۔ اسے ہر حال میں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ماں کی مرضی زیادہ عزیز ہے یا وہ چنڈال" بیگم نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"امّی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اس کی محبت اپنی جگہ اور آپ کی اپنی جگہ۔ ان دونوں میں کیسا مقابلہ" طارق نے جھلا کر کہا۔

"بس بس ـ ـ ـ میں ہاں یا نا کے سوا کچھ نہیں سُننا چاہتی۔"

"آخر آپ نے اس میں کیا بُرائی دیکھی ہے۔ آپ اس سے مل کر تو دیکھیں ـ ـ ـ ـ"

"میری جوتی ملتی ہے اُس سے؟ ـ ـ ـ ـ ـ"

"حد ہو گئی ہے ـ ـ ـ آپ اس قدر آپے سے باہر کیوں ہو رہی ہیں۔ ـ ـ ـ ـ" طارق نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ اُسے اپنی والدہ کا رویّہ اب بری طرح کھلنے لگا تھا۔

"امّی جان آپ کیوں اپنا سر کھپا رہی ہیں۔ طارق آپ کی بات ماننے سے رہے ـ ـ ـ" صفیہ نے جلتی پر تیل گرایا۔

"صفیہ تم امّی کو بھڑکا رہی ہو۔ مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔"

"ہمیں بھی آپ سے ایسی اُمید نہ تھی ـ ـ ـ" صفیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آج سے میں تمہاری ماں نہیں ہوں، اور نہ تم میرے کچھ لگتے ہو۔ بس آئندہ مجھ سے کلام کبھی نہ کرنا ——" بیگم صاحبہ غصّے میں بھری ہوئی اُٹھیں اور پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں۔

"ذرا رُکو تو" —— قدیر صاحب جواب سنجیدہ ہو رہے تھے۔ بیگم کی کہنی تھام کر بولے۔

"چھوڑیئے جی آپ" —— انہوں نے جھٹکے سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا —— "آپ کے سامنے اس ڈائن کو مجھ پر ترجیح دی گئی ہے اور آپ منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے ہیں۔ یہ سب آپ ہی کی شہ پر ہو رہا ہے ورنہ اس کی کیا مجال ——"

"بھئی حد ہو گئی —— ماں بیٹے کی لڑائی میں ہم دخل دینے والے کون کل کو تم پھر ایک ہو جاتے اور بُرے بنتے ہم۔"

"اب ایک ہونے کا کیا سوال۔ میں تو مرتے وقت بھی یہ وصیت کر جاؤنگی کہ اسے میرے جنازے میں بھی شریک نہ ہونے دیا جائے ——"

"لاحول ولا —— لعنت ہے ایسے غصہ پر۔ ذرا ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کرو تو تمہیں اپنا سارا غصہ بے معنی معلوم ہونے لگے گا والدین کی خوشی اولاد کی خوشی سے ہوتی ہے۔ اور ایک تم ہو کہ اپنی خوشی کیلئے اولاد کی خوشی کو ٹھکرا رہی ہو۔" انھوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"میں نے جو سوچنا تھا وہ سوچ لیا اب میری رائے قیامت تک نہیں بدل سکتی۔ آپ مجھے سمجھانے کی بجائے اُسے سمجھائیں۔"

"میں اسے بھی سمجھاؤں گا۔ لیکن اس وقت جب تم یہ وعدہ کرو گی جو فیصلہ میں کروں گا وہ تمہیں بھی منظور ہو گا۔ نفرت اور ضد سے کوئی مسئلہ طے نہیں ہو سکتا۔۔"
انھوں نے نرم لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گھر میں آج تک ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی۔ تمہارے دل میں اس لڑکی کے متعلق ایک گرہ سی پڑ گئی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں اس بات کی توقع ہی نہیں تھی کہ تمہارا چہیتا بیٹا اپنی ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے بھی محبت کرتا ہو گا۔ حالانکہ یہ عین فطرت کے مطابق ہے۔ میں اس لڑکی کے خاندان وغیرہ کے بارے میں پتہ کروں گا اور اگر وہ اچھے لوگ ثابت ہوئے تو مجھے اپنے بیٹے کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے ——" ساجدہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا وہ اپنے بھائی کا پڑا بھاری دیکھ کر خوش تھی۔

"لیکن بات پھر وہیں کی وہیں رہی۔ آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہ ایک الگ بات ہے۔ مجھے تو اعتراض ہو سکتا ہے۔ ——" بیگم پھر پلٹ پڑیں۔

"امّی جان جس معاملے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں آپ اس میں دخل کیوں دے رہی ہیں ——" صفیہ نے ماں کو گرم کیا۔

"تعلق کیوں نہیں —— یہ شادی کر کے اسے یہیں لائے گا کہیں اور تو نہیں لے جائے گا۔ اگر وہ یہاں آئی تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔"

"آپ کی پرواہ ہی کسے ہے ——" صفیہ نے جلتی پر تیل گرایا۔

"ہاں ہاں میری پرواہ کسے ہو گی ——" بیگم روہانسی ہو گئیں۔ شدتِ جذبات سے اُن کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔

"امی جان خدا کے لئے مجھے گناہ گار نہ کیجئے۔ مجھے یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ میرے گھر میں بھی وہی ڈرامہ کھیلا جائے گا جو قصے اور کہانیوں میں پڑھتا رہا ہوں ــــ آپ کچھ تو میرا خیال کریں۔"

"خبردار ہو تم نے مجھے امی کہا ــــ" بیگم صاحبہ کے آنسو چھلک پڑے

"چلو اُٹھو ــــ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہو گا ــــ" قدیر صاحب نے بیگم کا موڈ، خراب دیکھ کر کہا ــــ "کس مصیبت میں پھنس گیا ــــ نہ انھیں بتاتا اور نہ جھگڑا نکلتا ــــ"

بیگم صاحبہ تیز تیز چلتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں، دوسرے ــــ بوجھل قدموں سے ڈائننگ روم کی طرف ہو لئے۔ کھانے کی میز پر آج پہلی بار وہ لوگ بیگم صاحبہ کے بغیر کھانا کھا رہے تھے۔

طارق کھانے کے بعد اپنے کمرے میں گھس گیا۔ ہزار احتیاط کے باوجود بات کھُل گئی تھی۔ اس کا پروگرام تو یہ تھا کہ بتدریج اپنی پسند کا ذکر اپنے گھر میں کرے گا اور ایک امی ہی کی بدولت رفعت کی پسند کا اعلان ہو جائے گا اس طرح ساجدہ اور صفیہ کے ذہن پر بُرا اثر پڑنے کا کوئی احتمال نہیں تھا لیکن اب صورتِ حال بالکل اُلٹ ہو گئی تھی۔ بات گھر والوں پر کھُل چکی تھی اور اس کی امی اُس کی اس پسندیدگی سے اختلاف بلکہ نفرت کا اظہار کر چکی تھیں اب اس کو کچھ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا کرے۔ ایک طرف ایک سلجھی ہوئی اور من پسند لڑکی کی محبت تھی۔ اس سے کئے ہوئے قول و قرار تھے، اور دوسری طرف ماں کی رضا ــــ ماں جس سے اُسے بڑی محبت تھی۔ اور جسے گھر میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ رات دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہا اور آخر رفعت کو اس

ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد کہیں اُس کی آنکھ لگی۔

"کیا بات ہے طارق ـــــ آج تم چُپ کیوں ہو ـــــ" رفعت نے پوچھا وہ بڑی دیر سے طارق کی خاموشی کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ دونوں لارنس گارڈن کی ایک چوٹی پر اکیلے بنچ پر بیٹھے تھے۔ طارق اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو ـــــ"

طارق نے نفی کے انداز میں گردن ہلائی۔

"پھر بات کیوں نہیں کرتے۔ مجھ سے خفا ہو ـــــ؟"

"نہیں تو ـــــ" طارق پہلی بار بولا۔

"شکر ہے ـــــ تمہاری مہرِ سکوت تو ٹوٹی۔ خیر اب اصل سبب تو بتا دو ـــــ"

"نہ سُنو تو بہتر ہے ـــــ خوامخواہ پریشان ہو گی"

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم نے مجھے صرف خوشیوں کا ساتھی تصور کر رکھا ہے ـــــ" اس کی آواز میں خفگی تھی۔

"یہ بات نہیں ـــــ بس تمہیں پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"لیکن میں تمہیں پریشان کیسے دیکھ سکتی ہوں"

"دل نہیں چاہتا کہ تمہیں یہ بُری خبر سناؤں۔ لیکن خیر سُنو۔ میرے گھر والوں نے ہفتے کے روز ہمیں مال پر دیکھ لیا تھا۔ میری امّی اُس دن سے سخت ناراض ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ میں تم سے تعلقات ختم کر دوں" اس نے بات ختم کر کے

اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

رفعت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہ سے کوئی آواز بھی نہ نکل سکی ایسی بات سننے کی اسے کوئی توقع نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ طارق سے پیار کے سلسلے میں بالکل آزاد اور خود مختار ہے۔ وہ دونوں جو جی میں آئے کریں انھیں کوئی، نہ روکے گا نہ ٹوکے گا لیکن اچانک بالکل برعکس تصویر اس کے سامنے آگئی تھی۔

"اب کیا ہوگا ——" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ پل ہی پل میں اس کا سرخ و سفید چہرہ کملا گیا تھا۔ آنکھوں کے شفاف آئینے دھندلا گئے تھے۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں ——" طارق نے سر جھکاتے ہوئے کہا

"انھیں اعتراض کیا ہے ——"

"وہ چاہتی ہیں کہ میرے لئے اپنی پسند کی دلہن لائیں۔"

"اگر میں اُن سے ملوں تو یہ ممکن ہے وہ مجھے پسند کرلیں۔"

"توبہ توبہ —— خدا کیلئے ایسا کبھی نہ کرنا۔ میں نے یہی بات اُن سے کہی تھی لیکن اُنھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔"

رفعت بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"طارق کیا تم مجھے چھوڑ دوگے ——" اس نے یہ فقرہ ہولے سے کہا آواز میں مایوسی بھی ہوئی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ بیحد حسین اور دلکش نظر آرہی تھی۔ لمبے لمبے گھنے بال بنچ کی پشت پر لٹکے ہوئے تھے۔ کنول کے ڈنٹھلوں جیسی گوری گوری باہنیں اور چودھویں کے چاند جیسا گورا اور بھرا بھرا چہرہ۔ گہری سیاہ آنکھیں۔ جن سے مستی چھلک

رہی تھی۔ طارق اُسے دیکھ کر تڑپ گیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے اسے اتھاہ پیار دیا تھا۔ جسے اُسنے اپنے خوابوں میں پوجا تھا۔ وہی لڑکی اس وقت اس کے سامنے مایوسی اور نا اُمیدی کی گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ وہ تڑپ اُٹھا۔

"میری جان —— میری زندگی —— میری محبت —— میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ تم جو میری رگ رگ میں بس چکی ہو۔ جس کے ساتھ میری سانسوں کا تار بندھا ہے —— کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

وہ ہچکیوں کے درمیان اسے اپنے سینے سے لپٹائے بڑبڑائے چلا جا رہا تھا رفعت اُس کے سینے میں اپنے چہرے کو چُھپائے بمشکل اپنی چیخوں کو ضبط کر رہی تھی۔

وہ اتنی خوش قسمت ہوگی۔ اُس کا محبُوب اس پر جان فدا کرنے والا دیوتا ہوگا۔ اس بات کا اُس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ اور جب ایسی باتیں حقیقت میں سامنے آجائیں تو احساسِ تشکر صرف آنسوؤں میں ہی ڈھل سکتا ہے۔ اور اس وقت وہ اپنے آنسوؤں کا نذرانہ اپنے محبوب کی خدمت میں پیش کر رہی تھی۔

قسمت کے ستارے انسانوں کے خیالات پر مسکراتے ہیں ـــــ چمکتے رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنیوالا لمحہ اس کیلئے پھولوں کا ہار لائے گا یا کانٹوں کی مالا لائے گی۔ ہنستے بستے گھر آن کی آن میں دکھوں کے گھن گھور اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ کہیں غم کی اندھیری راتیں نورِ آفتاب سے خوشیوں کی سحر میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تقدیر روزِ اول ہی سے ایسے انوکھے کھیل کھیلتی چلی آ رہی ہے۔ قدیر صاحب کے گھرانے کی خوشیاں، سکون اور اطمینان ختم ہو چکا تھا۔ گھر کی چہکتی اور خوشیوں سے بھرپور فضا ان دنوں کسی ماتم کدے جیسا منظر پیش کرتی ہیں ایک ہی خاندان کے افراد دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے شدید مخالف ہو رہے تھے اگرچہ بغور دیکھا جاتا تو اس اختلاف اور نفرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ ماں بیٹے کی صورت سے بیزار تھی۔ طارق بھی ماں کو دیکھ کر کنی کاٹ کر نکل جاتا تھا۔ ساجدہ اور صفیہ بھائی اور ماں کی ہمدردی میں ایک دوسرے سے بول چال بھی بند کر چکی تھیں۔ ایک میز پر اکٹھے بیٹھ کر کھانا اور گپ شپ کے زمانے لد چکے تھے۔

طارق اور اس کی امی کے درمیان صلح صفائی کرانے کی کوشش جمیں

قدیر صاحب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، صاف طور پر ناکام ہو چکی تھی، کوئی بھی اپنی جگہ سے ٹلنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اسی دوران ضروری کاروباری مصروفیات کی بنا پر انھیں بیرونِ ملک جانا پڑا۔ مختلف فرموں کی جانب سے انھیں معاہدوں کی پیش کش ہوئی تھی۔ جن کیلئے ذاتی طور پر متعلقہ ممالک میں جانا ضروری تھا۔ وہ چلے گئے اور پھر گھر پر ایک گھمبیر سناٹا چھا گیا ـــــ، کون طارق اور کون بیگم قدیر، ان کے ذہن سے یہ سارا معاملہ معمول کے معاملات کی طرح کبھی کا ذہن صاف ہو چکا تھا۔

گھر کی فضا پر نحوست کے سائے منڈلاتے تھے۔ طارق سے ساجدہ کے سوا کوئی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن وہ دونوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے کہ صفیہ آگئی۔

"باجی آپ کو مجھ سے کیا شکائیت ہے ـــــ؟" طارق نے صاف دل سے پوچھا وہ بول چال کا خواہاں تھا۔

"ہو بھی تو تمہیں اس کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔" صفیہ نے چڑ کر کہا۔

"یہ آپ کا مفروضہ ہے۔ مجھے پرواہ نہیں ہو گی تو اور کسے ہو گی؟"

"اگر ایسا ہوتا تو پھر امّی جان کا یہ حال نہ ہوتا،" صفیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو بلا وجہ ضد پر اڑی ہوئی ہیں ـــــ آپ کو چاہیئے کہ انھیں سمجھائیں۔"

"لیکن میرا تو خیال ہے کہ اُن کی بجائے تمہیں سمجھایا جانا چاہیئے۔"

"میں حاضر ہوں ـــــ سمجھائیں کیا سمجھاتیں ہیں آپ"

طارق نے اسے گفتگو کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔

" اگر ماں کی زندگی عزیز ہے تو اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو "

" چاہے میری زندگی جہنم بن جائے ـــ "

یہ تمہارا وہم ہے۔ ہم تمہارے لئے اُس سے کہیں خوبصورت اور اچھی لڑکی ڈھونڈیں گے۔ وہ تمہیں کبھی یاد بھی نہ آئے گی "

" کیا یہ اس لڑکی کے ساتھ ظلم نہ ہو گا جس سے میں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہُوا ہے ـــ "

" ہاہا ـــ عہد ـــ یہ تو بدھوؤں کی باتیں ہیں۔ آج کل ایسی چیزوں کی کون پرواہ کرتا ہے ـــ " صفیہ نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

" تو آپ کے خیال میں سچّا وعدہ کرنا بیوقوفی ہے ـــ "

" اور نہیں تو کیا ـــ "

" یعنی زندگی میں جو جھوٹ بولے آپ اُسی کو عقلمند کہیں گی ـــ ؟ "

" ہاں ـــ جس آدمی کو اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہ ہو وہ بیوقوف نہیں تو اور کیا ہے۔ تم اس لڑکی کیلئے اپنی والدہ کو ٹھکرا رہے ہو، حالانکہ ہم تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور مال دار گھرانے کی لڑکی تمہارے لئے ڈھونڈ نکالیں گے ـــ "

" بس بس ـــ رہنے دیجئے ـــ معلوم ہو گئی آپ کی انسانیت اور عقلمندی۔ آپ صرف حُسن اور دولت پر زندگی کی خواہشات اور وعدوں کی صداقت کو وار دینا چاہتی ہیں ـــ حالانکہ میں تو اپنے وعدے کو نبھانے کیلئے

مرجانا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں —"

"تو مر جاؤ — اتنا چلا کیوں رہے ہو —"

"باجی بکواس بند کرو —" ساجدہ نے تڑپ کر کہا

"بہتر ہے میرے منہ نہ لگو —" صفیہ نے خونخوار نظروں سے ساجدہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ جو جی چاہے کہتی رہیں —"

"ہاں —"

"یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ کو سب کچھ کہنے کا حق ہے۔ تو پھر دوسروں کو بھی ہے۔ آپ کو وہ بھی سننا ہو گا۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی —"

طارق کا جی بھر آیا تھا۔ اُسے اپنی بہن کے یہ تلخ کلمات بھالا بن کر چُبھ گئے تھے۔

"میں آئندہ آپ سے بات کرتے وقت ضرور سوچ لوں گا کہ آپ کا جواب کتنا تکلیف دہ ہو گا —" اس نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہارے بغیر کوئی مرا بھی نہیں جا رہا —" صفیہ نے رعونت سے جواب دیا۔

"باجی آپ کو اپنی تلخ کلامی پر پچھتانا پڑے گا۔"

ساجدہ رہ نہ سکی۔

"پچھتائے میری جوتی —"

"کم ظرفی اور کم عقلی کی انتہا ہے ، ورنہ کوئی بہن اپنے بھائی کو ایسے لفظ نہیں کہہ سکتی ــــــ"

"میں کہتی ہوں تم بک بک نہ کرو۔ میری زبان نہ کھلواؤ۔ آئیں بڑی بھائی کی سگی ـ ـ"

"ساجدہ ــــ چپ رہو ــــ" طارق نے دخل دیتے ہوئے کہا ۔
"میں نہیں چاہتا کہ یہ گھر دشمنی اور نفرت کی آماجگاہ بن جائے ۔ اور تم صفیہ اٹھو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ جو تم لوگوں کے دل میں ہے کرتے پھرو۔ میں اب کسی کی پرواہ نہیں کروں گا ۔" اس کی آواز میں بلا کا تحکم تھا۔ صفیہ چُپ چاپ اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی ۔ ساجدہ اور وہ بڑی دیر تک چُپ چاپ بیٹھے رہے ۔

طارق مقرّرہ جگہ پر پہلے ہی سے موجود تھا ۔ رفعت کی ساری کلفت دُور ہو گئی ۔

"کیسے حال ہیں ــــ" طارق نے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا ۔

"ٹھیک ہوں ــــ"

"میری سندروں کے نیناں تندیالے ہو رہے ہیں ــــ" طارق نے اُس کی آنکھوں میں لال ڈورے دیکھ کر کہا ۔

"راتوں کو اتنا یاد آتے ہو نیند ہی نہیں آتی ــــ"

"ستارے گنا کرو ــــ" طارق نے ہنستے ہوئے کہا ۔ وہ بنچ پر بیٹھ

چکے تھے۔

"نجانے کتنی بار گن چکی ہوں ——"

"بتاؤ کتنے ہیں ——"

"پانچ کھرب، پانچ ارب، پانچ کروڑ، پانچ ہزار، پانچ سو پانچ۔"

"غلط ——" طارق نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم بتاؤ کتنے ہیں ——" اس نے انتہائی سادگی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پانچ کھرب، پانچ ارب، پانچ کروڑ، پانچ ہزار، پانچ سو چار"

"تم اپنا ستارہ گننا بھول گئے ہو گے۔"

"وہ تو میں نے پہلے ہی گن لیا تھا۔"

"تم سے کہیں غلطی ہو گئی ہو گی۔"

"ناممکن ——"

"یاد آیا۔ جب تم نے گنے ہوں گے تو ایک ستارہ ٹوٹ گیا ہو گا ——"

"ٹھیک بالکل ٹھیک —— آؤ اب ٹہلیں ——" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ساتھ وہ گنگنانے لگا۔

"تارا ٹوٹا سب نے دیکھا"

وہ مال روڈ پر آ گئے۔ الفلاح کے قریب پہنچ کر طارق رُک گیا۔

"کیوں —— رُک کیوں گئے۔"

"یہی وہ منحوس جگہ ہے۔ جہاں امّی نے مجھے اور تمہیں دیکھا تھا۔"

" اونہہ ـــــ یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں ہماری مقدس محبت پہلی بار دُنیا پر ظاہر ہوئی تھی ـــ میرا تو یہاں سجدہ کرنیکو جی چاہتا ہے ـ تم کیا جانو یہ جگہ تو ہماری محبت کی ابتداء ہے ـ ابھی تو ہماری جدوجہد شروع ہوئی ہے ـــ ایک دُوسرے کو پا لینے کی جدوجہد دیکھیں ہم اس میں کب کامیاب ہوتے ہیں ـــ "

طارق حیرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا ـ اس کی باتوں نے اسے سخت حیرت میں مُبتلا کر دیا تھا ـ محبت نے اس لڑکی کو کتنا دلیر بنا دیا ہے ـــ اس نے سوچا ـــ " کبھی یہ میرے ساتھ چلنے سے بھی گھبراتی تھی ـ ڈرتی تھی ، شرماتی تھی اور آج ـــــ " اُس نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ـ

" تم تو پوری سیاست دان بن گئی ہو ـــ مجھے تو اُمید ہی نہیں تھی کہ تم بھی ایسی باتیں کہو گی یا اس طرح سوچو گی ـ لڑکیاں ذرا بزدل ہوتی ہیں نا ـــ "

" چھوڑو اس بات کو ـــــ " رفعت نے جواب میں کہا " تم یہ بتاؤ کہ تمہاری اپنی امّی سے بول چال شروع ہوئی ہے یا نہیں ـــ ؟ "

" ابھی تو نہیں ـــــ "

" تمہیں میری قسم ہے ، اُنھیں جلد از جلد راضی کرو ـ "

" میں خود یہی چاہتا ہوں جان ! مگر کیا کروں ـ وہ تو جیسے پتھر ہی بن گئی ہیں ـ کیا مجال جو کبھی میری طرف دیکھ بھی لیں ـ میں تو ان کے روّیے کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں ، کبھی وہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ ، عزیز رکھتی تھیں ـــــ "

"تم انھیں اب بھی اتنے عزیز ہو ——"

"غلط ——"

"طارق —— مرد کتنے بھی عقل مند کیوں نہ بن جائیں وہ عورت کے دل کا بھید نہیں پا سکتے۔ میں ان کے جذبات کو تم سے زیادہ سمجھتی ہوں"

"سمجھتی رہو ——" طارق کی آواز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"جناب کا موڈ کیوں آف ہو رہا ہے ——"

"تم تو امّی کی طرفداری کر رہی ہو ——"

"نہیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو کوئی اور بات کرو۔"

ساجدہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔

"اوئی اللہ ——" بے ساختہ رفعت کے منہ سے نکل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے طارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طارق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیوں —— کیا بات ہے ——"

"ساجدہ کو پتہ چل گیا تو یہ بات سارے کالج میں بھی پھیل سکتی ہے" رفعت نے کسی قدر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پگلی ——" طارق نے چلتے چلتے اُس کے شانے کو تھپتھپایا۔ ساجدہ کو اس بات کا پتہ چلنا ہی نہیں چاہئیے تھا۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ سنجیدگی اختیار نہ کرتا تو میں ہرگز اُسے علم نہ ہونے دیتا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ

اُسے رازدار بنا کر اعتماد میں لیا جائے۔ گھر میں ابّا جان کے بعد اسی کی ذات ایسی ہے۔ جس پر مجھے کامل بھروسہ ہو سکتا ہے۔ وہ یقیناً اس بات کا بُرا نہیں منائے گی کہ میں نے اُس کی ایک سہیلی سے پیار کیا اور تم نے اس کی سہیلی ہو کر اس کے بھائی کو اپنی زلفوں کا اسیر بنایا!!

رفعت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میری بات سنجیدگی سے سُنو ـــــــ" وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہُوا کہہ رہا تھا۔

"وہ بڑی سُلجھی ہوئی لڑکی ہے، اور گھر بھر میں سب سے زیادہ مُجھ سے محبّت کرتی ہے۔ جب اس ساری صورتِ حال کا اُسے علم ہو گا تو یقیناً وہ ہمیں بہتر مشورے دے سکے گی اور اس کے علاوہ گھر میں ہمارے مُوقف کا دفاع بھی کرے گی۔"

"اور ہاں ـــــــ" رفعت نے قطع کلامی کرتے ہُوئے کہا۔ "وہ میری عزیز ترین سہیلی ہے، اور مجھے پُورا یقین ہے کہ وہ میرا یہ راز ہرگز دوسروں پر افشاء نہیں کرے گی، جب کہ معاملہ اس کے بھائی کا ہے"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو ـــــــ" طارق نے کہا

"وہ یقیناً ہم دونوں کیلئے ایک پناہ گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔"

"پھر کب ملوا رہے ہو ـــــــ"

"کل ہفتہ ہے۔ میں اُسے آج کہہ رکھوں گا۔ تم ٹھیک چار بجے چڑیا گھر کے دروازے پر پہنچ جانا ـــــــ" طارق نے اُسے پروگرام

سے آگاہ کیا۔

"بھئی خوب لُطف رہے گا ـــــــــ"، رفعت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا وہ سمجھتی ہو گی کہ پتہ نہیں بھیّا کی پسند کون سی لڑکی ہے۔ کیا عجیب عجیب خیالات اُس کے ذہن میں نہیں آئیں گے۔ گفتگو شروع کرنے کے سو طریقوں پر غور کرے گی۔ لباس کا انتخاب بڑا سوچ سمجھ کر کر کے آئے گی۔ لیکن جب مجھ سے سامنا ہو گا تو ـــــــــ رفعت ایک بار پھر ہنسی کے طوفان میں بہہ گئی۔ صورتِ حال واقعی عجب نظر آ رہی تھی۔

"اس وقت تم جس قدر جی چاہے ہنس لو۔ لیکن میری یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اُسے متاثر کرنا اور غلط فہمیوں کو اس کے ذہن سے صاف کرنا ممکن ہے بڑا کٹھن ثابت ہو۔ گھر میں پیدا ہونے والے اختلافات کا اُس کے ذہن پر اثر ہونا بھی ایک لازمی سی چیز ہے ـــــــــ"، طارق نے اُسے آگاہ کیا۔

"اتنی سنجیدگی کی تو مجھے توقع نہیں، ہاں وہ کچھ دن تک مجھے خاص طنز و مزاح کا نشانہ بنائے رکھے گی۔ کالج میں بھی شائد ہی میرا پیچھا چھوڑے خیر کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا کیا ہوتا ہے ـــــــــ"، رفعت نے ہنسی روکتے ہوئے جواب دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ لارنس میں داخل ہو چکے تھے۔ اِکّا دُکّا لوگ آ جا رہے تھے۔ سردیوں کا سورج غروب اور اُفق کا مغربی کنارا لہو لہان ہو رہا تھا۔ اُجالا ہولے ہولے گھٹنے لگا۔ دھوپ کی پسپائی کے بعد ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ لارنس کے سبز سرو ڈھلتے

دھوپ میں بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔

"آؤ پہاڑی پر چلیں ——" طارق نے رفعت کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے ——" رفعت نے بن کر کہا۔

"میں گود میں اٹھا کر لے جاؤں گا"

"پتا بھی ہے میں کتنی بھاری ہوں"

"پانی کے لئے کشتیاں اور ہوا کے لئے خوشبو ذرا بھی بھاری نہیں ہوتی۔"

رفعت نے ممنون نظروں سے اپنے محبوب —— اپنے ہونے والے خاوند کی طرف دیکھا جس کی نظروں سے اتھاہ پیار چھلک رہا تھا۔ وہ شرما سی گئی۔

وہ چپ چاپ پہاڑی کی طرف جانے والی ڈھلوان راستے پر ہولئے ان کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ محبت اور رفاقت کے شدید جذبے نے انھیں مخمور کر رکھا تھا۔ ان کے دل گہرے نورانی درد سے لبریز تھے۔ وہ چلتے رہے۔ چاروں طرف بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔

باب

گھر میں ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ امّی جان نے طارق کے سخت لہجے میں کہے گئے الفاظ سُن لئے تھے۔ اُنھیں اسی بات کا ڈر تھا کہ کہیں طارق بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اس کو اُنھوں نے جنم دیا تھا اور پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ وہ اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ جب تک وہ تذبذب میں پھنسا رہے خطرناک نہیں ہوتا لیکن جوں ہی وہ کسی فیصلے پر پہنچ کر اپنے ارادے کو پورا کرنے میں اڑ جائے تو پھر اسے اس کے مقام سے ہٹانا ایک مشکل کام ہی ہوتا ہے اُنھوں نے سوچا کہ اب وہ اپنے بچّے کی خواہش کے سامنے جھک جائیں لیکن پھر اُن کی انا آڑے آگئی اور وہ غصّے میں گرجتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف آئیں۔

"خبردار جو تم نے آئندہ صفیہ کے لئے سخت لفظ منہ سے نکالے اور کان کھول کر سُن لو، آئندہ کے لئے تمہیں ہرگز ہرگز اس کوٹھی کے احاطے میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔" اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شائد دب جاتا لیکن طارق نے شائد زندگی میں پہلی بار

ماں کیلئے نفرت کا اظہار کیا۔

"ہنہ ـــــــ" اس نے لاپرواہی سے سر کو جھٹکا دیتے ہُوئے کہا۔ جب تک ابّا جان جاپان سے واپس نہیں آجاتے مجھے اس کوٹھی سے کوئی نکال بھی نہیں سکتا اور اُن کے آنے کے بعد شائد کوئی مجھے یہاں رہنے پر مجبور بھی نہ کر سکے گا۔"

بیگم صاحبہ دھک سے رہ گئیں۔ طارق نے اب اُن کے سامنے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا تھا ـــــــ یہ اُن کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ اُنھوں نے بپھرے ہُوئے اپنے پاؤں سے سلیپر اُتارا اور طارق کے مُنہ پر کھینچ مارا۔

"جہنم جلے ـــــــ کمینے ـــــــ تو میرے سامنے بولتا ہے بے حیا خدا تجھے غارت کرے تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گیا۔ تیری لاش دیکھنی نصیب ہو ـــــــ کتے ـــــــ"

وہ گالیاں بکتی اور چیختی چلّاتی رہیں۔ وہ چُپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

گھر کی فضا میں گھُٹن اور زیادہ بڑھ گئی۔ طارق اور ساجدہ کی حیثیت اب امّی جان اور صفیہ کیلئے اجنبویوں جیسی تھی۔ باورچی کھانا تیار کر کے رکھ دیتا تھا اور سب لوگ باری باری کھا لیتے تھے۔ طارق کے حِصّے کا کھانا اکثر باسی پڑا رہتا تھا اور صُبح اُٹھا کر کسی ملازم کو دے دیا جاتا تھا وہ اب رات

کو دیر سے آتا تھا اور مُنہ اندھیرے ہی باہر نکل جاتا تھا۔ بول چال سب سے بند ہو چکی تھی۔ ساجدہ بیچاری کی حالت بہت زیادہ خراب تھی ماں اور بہن اُس کو بھائی کا ساتھی سمجھ کر مُنہ نہیں لگاتی تھیں اور طارق راتوں کو دیر سے آتا اور صبح جلدی چلا جاتا۔ بیچاری کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آج وہ بیحد بھری بیٹھی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے اور طارق ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ اس وقت ڈرائینگ رُوم کے باہر برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بلب کو اس نے بجھا دیا تھا۔ تاکہ طارق اس کی موجودگی سے بے خبر رہے۔

خُدا خُدا کر کے وہ ساڑھے دس بجے کے قریب کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہُوا۔ دروازے کی روشنی میں ساجدہ نے دیکھا لباس پر شکنیں تھیں اور بال بکھرے ہُوئے تھے۔ چہرہ زرد اور مُرجھایا ہُوا تھا۔

"بھیّا ——" اُس کے قریب پہنچنے پر اُس نے تقریباً روتے ہُوئے سرگوشی کی۔

"پگلی کہیں کی ——" طارق نے اُسے سینے سے لپٹا کر تھپتھپایا وہ اس کے غم کی وجہ جانتا تھا۔ گھر میں وہی تو ایک ایسی ہستی تھی جس سے وہ سچی محبّت اور ہمدردی حاصل کر رہا تھا۔ اور وہ ہستی ساجدہ ہی تو تھی۔ اس نے ایک بار پھر اُسے بھینچ کر پیار کیا اور یہ کہتا ہُوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"کل شام چار بجے تیار ہو جانا —— تمہیں تمہاری بھابی

سے ملواؤں گا ——"

دُوسرے روز طارق جب گھر پہنچا تو ساجدہ تیار ہو کر اُس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

" اُف —— تم نے تو کمال ہی کر دیا بھئی —" طارق نے مصنوعی ہکلاہٹ سے کہا۔

"میرا تو خیال تھا کہ تم سو رہی ہو گی —— تم تو بالکل تیار بیٹھی ہو"

" بھابی سے ملنے جا رہی ہوں —— کوئی مذاق تھوڑی ہے ——"

" اسی لئے اتنا بہت سا میک اَپ چہرے پر تھوپ لیا ہے " طارق نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔ یہ اس کی کتنی بڑی خوش قسمتی تھی کہ ساجدہ جیسی بہن اسے میسّر تھی ورنہ گھر کے ماحول میں تو وہ تقریباً اکیلا ہی رہ جاتا۔

" اچھا جناب اب باتیں بند" ساجدہ نے کھڑے ہو کر کہا پُورے چار ہو رہے ہیں۔ اب ہمیں چل دینا چاہیئے۔

" ہاں ٹھیک ہے" —— طارق نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ ہم ٹیکسی منگوا لیں ۔ باہر جا کر اس کا انتظار

تکلیف دہ ہوگا۔ اتنی دیر میں مَیں مُنہ ہاتھ دھو لوں گا۔"

"ٹھیک ہے پھر جلدی کریں۔ میں نوکر کو ٹیکسی لانے کے لئے کہے دیتی ہوں ــــــ" ساجدہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔ طارق نے بھی غُسل خانے کی راہ لی۔

آدھ گھنٹہ بعد وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھے لارنس کی طرف رواں دواں تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک بوڑھا تھا جو گاڑی بڑی احتیاط سے چلا رہا تھا۔

"کہاں ملنے کا پروگرام بنایا ہے ــــــ" ساجدہ نے طارق سے پوچھا وہ جگہ کے متعلق پوچھنا بھول ہی گئی تھی۔

"وہ ٹھیک پانچ بجے چڑیا گھر کے دروازے پر ہوں گی۔"

"بھیّا اُن کا نام تو بتاؤ ــــــ"

"نام ــــــ نام وام کچھ نہیں۔ تو دُاسی سے پوچھنا" طارق نے طرح دینی چاہی۔ لیکن ساجدہ کہاں چھوڑنے والی تھی۔

"نہیں آپ ابھی بتائیں۔ نہیں تو ہم ناراض ہو جائیں گے، اس نے بچّوں کی طرح مُنہ پُھلا کر کہا۔

"ہٹ" طارق نے ہلکی سی چپت رسید کرتے ہُوئے کہا۔

"بھلا دیر ہی کتنی ہے ــــــ تھوڑا سا سسپنس رہنے ہی دو تو بہتر ہیں ــــــ"

"اچھا اچھا ــــــ میں سمجھ گئی ــــــ آپ مجھے حیران

کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں بھئی —— یہی بات ہے" —— طارق نے جواب دیا۔

اس وقت وہ لارڈز کے پاس سے گزر رہے تھے۔

"رات کا کھانا یہاں کھائیں گے ۔۔۔" —— طارق نے کہا۔

"مجھے تو تکے کباب پسند ہیں۔"

"تمہاری بھابی کو بھی —— ٹھیک ہے ہم تکے کباب ہی کھائیں گے"

"بھابی کو پسند نہ ہوتے تو آپ کبھی نہ کھلاتے ۔۔۔"

"یہ بات نہیں بھئی۔ جو تم کہتیں تمہیں کھلا دیتا، جو وہ کہتی اُسے کھلا دیتا۔۔۔"

"ترجیح تو آپ بھابی کی پسند کو دیتے"

"وہ کیوں بھئی۔ —— تمہارا وہم ہے"

"چلئے صاحب —— مان لیتے ہیں"

طارق ہنس دیا اس کی بہن چھیڑ چھاڑ میں اُس سے میلوں آگے تھی چڑیا گھر کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی وہ ٹھک ٹیکسی سے اُتر پڑے اور کرایہ ادا کر کے پیدل اندر آگئے۔ سامنے چڑیا گھر کا داخلی دروازہ تھا۔

موسم اچھا ہو تو لاہور کے شہری عموماً باغوں میں گھومنا بہت

پسند کرتے ہیں، اس وقت بھی موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ بچے اِدھر اُدھر ہنس کھیل رہے تھے۔ لوگ چڑیا گھر کے اندر آجا رہے تھے۔ ساتھ ہی دُکانوں پر ٹرانسسٹر ریڈیو گلا پھاڑ رہے تھے۔ طارق نے دُور ہی سے رفعت کو دیکھ لیا تھا وہ لڑکیوں کے ایک جھگھٹ کے قریب ایک آٹھ دس سال کے بچّے کے قریب کھڑی تھی۔ طارق نے ساجدہ کی طرف دیکھا وہ اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اس کی نگاہیں بھی اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ جس بات سے وہ آج تک جھجک رہا تھا وہ پیش آرہی تھی اس نے خود کو سنبھالا اور ساجدہ سے بولا۔

"اِدھر آؤ بجو——" اُس نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"رفعت اُدھر کھڑی ہے ——"

ساجدہ نے اُدھر دیکھا —— اُس کی اپنی سہیلی رفعت کھڑی اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سناٹے میں آگئی۔

"چلو۔ آگے جاکر اُسے ساتھ لو ——" طارق نے کہا۔

"اُسے کسی قسم کا ملال نہ ہونے پائے۔"

"ملال کیسا بھیّا —— وہ تو مجھے جان سے بھی عزیز ہے۔"

ساجدہ نے حیرت اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات سے کہا۔ دونوں ایک دُوسرے کی طرف تیزی سے بڑھیں اور ایک دُوسرے سے لپٹ گئیں۔

"اری چڑیل ——" ساجدہ نے جذبات سے بھری ہُوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"تو نے بھیّا ہی کو تاڑا تھا"

"ساجی ——" وہ اُسے ساجی کہا کرتی تھی۔

"میری بنو —— اس عجیب اتفاق نے تو مجھے حیران وخوش کر دیا ہے میری اچھی رفو —— میری بھابی ——" ساجدہ نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ارد گرد کے لوگ اُن کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ طارق نے انھیں مطلع کیا۔

"لوگ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں —— چلو کہیں بیٹھ جائیں"

"چلو ——" دونوں بیک زبان بولیں۔

"یہ کون ہے ——" ساجدہ بچّے کا ہاتھ تھامتی ہوئی بولی۔ "بڑا خوبصورت بچّہ ہے"

"میرا چھوٹا بھائی ہے ——"

"آؤ منّے ——" ساجدہ نے بچّے کو اپنے قریب کر لیا۔

کیفے ڈی لا بیلے میں بیٹھے وہ دیر تک ہنستے رہے۔

"رفّو مجھے تم سے بڑی شکایت ہے۔ تم نے اس بات کا مجھ سے کیوں نہ ذکر کیا۔

"ذکر کیا کرتی۔ تمہاری ناراضگی کا خوف بھی تو تھا ——" رفعت نے سر جھکاتے ہُوئے جواب دیا۔

" اور بھیا ـــــ آپ کو تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ نے چوری چھپے ہی میری سہیلی کے دل پر ڈاکہ ڈالا۔ "

طارق کا دل بھر آیا، اُس کی بہن اس کیلئے کتنی مخلص اور ہمدرد تھی اُس نے اُسے معاف کر دیا تھا اور رفعت سے تعلقات کا قطعاً بُرا نہیں منایا اس کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملانے لگے، بولنا چاہا لیکن آواز اُس کا ساتھ نہ دے سکی رفعت اور ساجدہ نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

" ساجی ـــــ تمہارے بھیّا تم سے بڑی محبت کرتے ہیں " رفعت نے بات کو بدلنے کیلئے کہا۔

" میرے بھیّا مجھے اپنی جان سے بھی پیارے ہیں " ساجدہ نے محبّت سے کہا۔

" اور تم دونوں ـــــ چڑیلیں ہو ـــــ " طارق اپنے جذبات کو ہمیشہ مزاح کے پردے میں چھپا دیا کرتا تھا۔ دونوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔

رات کا پرندہ زمین پر اپنے پر پھیلا رہا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ستارے نکلنے لگے تھے۔ باغ کا ماحول اس وقت دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ ٹہلنے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ طارق نے بل ادا کیا۔

روشوں پر ٹہلتے ٹہلتے کافی دیر خاموشی رہی۔

" تم لوگ خاموش کیوں ہو ـــــ کچھ بات کرو " طارق نے خاموشی کو توڑا۔

" آپ کی موجودگی میں ہم اب کوئی بات نہیں کریں گے بھیّا" ساجدہ نے حکم سنایا۔

" اب یہ نند اور بھابی کا ذاتی معاملہ ہے۔ "

" اچھا بھیّا۔ ——— ہم ہی غیر ہو گئے ——"

" ارے بھیّا —— آپ تو رونے لگے —" ساجدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

" چلیں آپ بھی ہم میں شامل سہی "

" تم بہن بھائی کی محبّت تو مجھے رشک کرنے پر مجبور کر رہی ہے "

" دیکھیں اس کو حسد میں نہ تبدیل ہونے دینا " ساجدہ نے رفعت کے چٹکی لی۔

" ورنہ گھاٹے میں رہو گی۔ —"

" ارے جناب —— ہم تو آپ کی محبّت کو دیکھ کر جئیں گے" رفعت نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔

" میں تو زندگی بھر یہ احسان فراموش نہیں کر سکوں گی "

" کیسا احسان ——— " ساجدہ نے تعجب سے پوچھا۔

" یہی کہ تم نے اپنے بھائی اور میری محبّت کو غلط نظروں سے نہیں دیکھا اور ہمدردی کا سلوک کیا۔ میں تو ڈرتی تھی کہ کہیں تم بُرا نہ مان جاؤ۔ "

بنو بی —— اس میں بُرا ماننے والی کوئی بات نہ تھی۔ اگر مجھے

پہلے معلوم ہوتا کہ بھیّا تم سے پیار کرتے ہیں تو کبھی اس جھگڑے کی نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن خیر اب جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ آئندہ کے لئے سوچنا پڑے گا کہ کیا کیا جائے۔" ساجدہ نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ طارق رفعت کے بھائی کو ساتھ لئے کافی پیچھے آ رہا تھا۔

"تمہارا شکریہ جو تم نے اتنی مہربانی کی ——"

"پھر وہی کمینگی ——" ساجدہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"نہیں ساجدہ۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"خیر چھوڑو اس قصے کو —— اب بتاؤ آگے کیا کیا جائے۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں" رفعت نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہارے گھر والے راضی ہو جائیں گے ——؟" ساجدہ نے پوچھا۔

"انھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"پھر بھی ——"

"تم خود کسی وقت چلی آنا۔ امّی سے پوچھ لینا وہ تمہیں جانتی ہی ہیں" رفعت نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے —— میں جلد ہی تمہارے گھر آؤں گی۔ اور ہاں میں نے ابّا جان کو جاپان لکھ دیا ہے کہ امّی بھیّا کی سخت مخالفت کر رہی ہیں، انھوں نے جواب میں یقین دلایا ہے کہ جو بھیّا کی مرضی ہو گی وہی ہو گا۔"

"لیکن امّی کی ناراضگی کس طرح رفع ہو گی۔"

"اب اُن کی ناراضگی رفع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ معاملہ اب ان حدُود سے بہت آگے نکل چکا ہے۔"

"تمہارے ابّا جان اسے پسند کریں گے ——؟"

"اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

"پھر ——" رفعت نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میری بنو —— میری بھابی بنے گی ——" ساجدہ نے چٹکی لی اور شرما گئی۔

"کیا سازشیں ہو رہی ہیں بھئی ——" قریب پہنچتے ہُوئے طارق نے اُن سے کہا۔

"آپ کو عُمر قید سُنانے کی" ساجدہ نے چوٹ کی۔ طارق ہنسنے لگا۔ اُس نے بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کی شکل رفعت سے بہت زیادہ ملتی تھی طارق اُسے پیار کرنے لگا۔

ایسی ہی چھیڑ چھاڑ اور سیر و تفریح میں سات بج گئے۔ باغ میں روشوں پر اب اِکّا دُکّا لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ دھیرے دھیرے باتیں کرتے وہ باہر سڑک پر آئے جہاں سے ٹیکسی لے کر اُنھیں صفاں والے چوک جانا تھا تکے کباب کے شغل کے درمیان اُن لوگوں نے آپس میں خاصی سنجیدگی سے گفتگو کی اور مختلف مسائل پر رائے زنی ہوتی رہی۔ آخر چند روز بعد ملنے کا وعدہ کر کے وہ گھروں کو روانہ ہو گئے۔ ساجدہ رفعت کے ساتھ ٹیکسی میں چلی گئی تاکہ وہ اسے اُتار کر گھر پہنچ جائے۔ طارق مین مار کیٹ

کے قریب اُتر گیا تھا یہاں سے گھر نزدیک ہی تھا۔ ساجدہ رفعت کو گھر میں اُتار کر واپس چلی آئی۔

باب ۸

خُدا جانے اُس کا اصلی نام کیا تھا لیکن شناساؤں میں وہ نادر کے نام سے مشہور تھا۔ شہر کے سارے سمگلر، چور، اُچکے، اٹھائی گیرے، جواری اور دلّال اسے اپنا ہیرو تصوّر کرتے تھے اور ہر وقت اس کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ اس کا گھر بدمعاشی کا بہت بڑا اڈہ تھا جہاں دن رات دوسروں کے حال پر عیاشی کی جاتی تھی۔ دعوتِ ناؤ نوش اور اکثر راتوں کو محفلِ رقص و سُرور تقریباً ایک ضروری چیز سمجھی جاتی تھی، دن بھر رشوتیں وصول کرنے والے بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اہل کار اپنی راتیں اسی کے اڈے پر بسر کرتے اور روز کی کمائی وہاں لٹا کر صُبح دَم ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھروں کو سدھارتے تھے۔

گھر کی اصل منتظمہ نادر کی بہن خورشید تھی۔ وہ حُسن اور جوانی کے ساتھ ساتھ عیاری اور مکاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کی خوش گفتاری بدمعاشوں کے حلقے میں بےحد مشہور تھی، بڑے بڑے پُرانے پاپیوں کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے اس دھڑلے کی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اگر اُن کے گروہ کا کوئی آدمی کبھی پولیس وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا تو اُسے چھڑانے کے لئے

پہلے رشوت اور سفارش کو آزمایا جاتا۔ لیکن جہاں یہ دونوں چیزیں ناکام ہو جاتی تھیں وہاں خورشید کو استعمال کیا جاتا برس ہا برس سے وہ ایسی خدمات انجام دے دے کر اپنے فن میں طاق ہو چکی تھی۔ آج تک ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا جس میں وہ ناکامی سے دوچار ہوئی ہو۔

دونوں کے پاس بے انتہا دولت تھی لیکن اس کے باوجود اُن کی ہوس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہر بُرے بھلے طریقے سے وہ دولت سمیٹنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ سب سے بڑا جرم جس کے لئے انھیں معاف نہیں کیا جاسکتا تھا وہ یہ تھا کہ مال دار لوگوں کی خواہش کے مطابق انھیں حسین و جمیل لڑکیاں بھی سپلائی کی جاتی تھیں، زمانۂ تعلیم کے دوران خورشید نے بے شمار سہیلیاں بنائی تھیں جن کو وہ اپنے اعتماد میں لے کر بدمعاشوں سے ملایا کرتی تھی اور پھر اُن کی قابلِ اعتراض حالت میں تصویریں لے کر انھیں بلیک میل کیا کرتی، کئی معصوم لڑکیاں اُس کے چنگل میں پھڑ پھڑا رہی تھیں، اور شریفانہ زندگی گزارنے سے محروم تھیں۔ قانون نے کئی بار اُس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی، لیکن ہر بار وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے محفوظ رہ جاتے تھے اسی لئے اُن کے حوصلے بھی کافی بڑھے ہوئے تھے۔

اتفاق کی بات یہ تھی کہ کالج کے زمانے میں خورشید، ساجدہ اور صفیہ سے بھی واقف تھی۔ کئی بار اُن کے گھر بھی آنا جانا ہوا تھا۔ اور طارق کی شکل بھی دیکھنے میں آئی تھی لیکن طارق خود ہی اپنی بہنوں کی سہیلیوں کو مل بیٹھنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ طارق اُسے اچھا لگا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اس

سے مراسم بڑھائے لیکن کچھ حالات پیدا ہوتے رہے کہ کبھی مل بیٹھنے کا موقع دستیاب نہ ہُوا۔ اس کے باوجود وہ طارق کو بھولی نہیں تھی، ساجدہ اور صفیہ کے خیال میں وہ صرف ایک چنچل نٹ کھٹ اور حسین وجمیل مگر شریف لڑکی تھی۔ اس کے کردار کے تاریک رُخ کا اُنھیں ہرگز علم نہیں تھا۔ صفیہ خاص طور پر اُسے پسند کرتی تھی اور اس کے سامنے کئی بار اُسے بھابی بنانے کا ذکر دبے لفظوں میں کر چکی تھی یہ اتفاق ہی تھا کہ بات ہنسی مذاق سے کبھی آگے نہیں بڑھی تھی۔

آج نجانے کیا بات تھی کہ طارق کا چہرہ بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ وہ ابھی سو کر اُٹھی تھی۔ اور شائد خواب میں اُس بھولی بسری یاد سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

" طارق نہ جانے اس وقت کہاں ہو گا۔ اسے تو کبھی میری یاد بھی نہیں آتی ہو گی، ہو سکتا ہے اُسے میرا نام بھی معلوم نہ ہو، اس سے ڈھنگ کی، ملاقات بھی تو نہیں ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ دو تین بار سرسری طور پر آمنا سامنا ہُوا ہے۔ ہائے وہ کتنا خوبصُورت تھا۔ خاموش جوان اور مالدار"

وہ سوچتی رہی اور جھومتی رہی، آخر کار اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی اور ابھی طارق کے گھر جائے گی تاکہ ساجدہ اور صفیہ سے مل لے، شائد اس طرح دیدارِ یار بھی ہو جائے

بلا مبالغہ اُس نے بن سنورنے میں دو گھنٹے صرف کر دئیے آج وہ اتنی خوش تھی جیسے کوئی جلاوطن برسوں بعد اپنے وطن پہنچنے کی اُمیدیں

پوری ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اپنی خوبصورت کار میں وہ صفیہ کے گھر پہنچی۔ پھاٹک کھلا تھا وہ گاڑی اندر ہی لیتی چلی گئی۔ ہارن کی آواز سن کر صفیہ اور ساجدہ دونوں کمرے سے باہر آگئیں تھیں صفیہ چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

"اوہو آج تو سولہ سنگار کر کے آئی ہو ——" اس نے خورشید سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو یہ تعریفیں کبھی بھول کر یاد بھی نہ کیا ہوگا۔"

"میری بنّو اندر تو چلو —— تمہارے سب گلے شکوے سر آنکھوں پر" صفیہ اسے دھکیلتی ہوئی لائی۔

"بیٹھو بیٹھو ——" ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ پر دھکا دیتے ہوئے صفیہ نے اس سے کہا۔

"میں نے تم دونوں بہنوں جیسی بے مہر سہیلیاں نہیں دیکھیں" خورشید نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں کیا ہوا ——" ساجدہ نے پوچھا۔ وہ قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

تم لوگوں سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اپنے بھائی کی شادی میں مجھ کو بلوا بھیجتیں ——" اس نے پانسہ پھینکا۔ دراصل وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ —— درمیانی عرصے میں کہیں طارق کی شادی تو نہیں ہوگئی

"لو اور سنو ــــ" صفیہ نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

"تمہیں کس ذریعے سے خبر پہنچی ہے کہ طارق کی شادی ہو گئی"

"کیوں کیا اُن کی شادی نہیں ہُوئی ــ"

"کمال کرتی ہو۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں گیا"

"اچھا ــــ" خورشید نے اطمینان کا سانس لیتے ہُوئے کہا۔ مجھ سے کسی نے غلط کہا تھا ــ"

"کس نے کہا تھا۔ ــــ"

"بھئی ایک ــــ تم چھوڑو اس کو ــ سُناؤ تم دونوں کی شادیاں کب ہو رہی ہیں ــــ" اُس نے بات کو پلٹتے ہُوئے کہا۔

"ہماری شادیاں ــــ" دونوں بہنوں نے تعجب سے کہا اور شرما کر رہ گئیں۔

"ہاں بھئی ــــ کیا تم لوگ شادی نہیں کرو گی ــ"

"چل ہٹ بے حیاء ــــ" صفیہ نے گھُرکی دی۔

"تم خود بتاؤ کس سے شادی کر رہی ہو۔"

"جس سے تم کروا دو" خورشید نے مُنہ پھاڑ کر کہا۔ وہ اتنی ہی بے جھجک تھی۔

"میں نے کوئی شادیاں کرانے کا دفتر کھول رکھا ہے ــ"

صفیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں کھولا تو اب کھول لو۔ ایک گاہک تو موجود ہی ہے" خورشید نے شوخی سے کہا۔ اتنے میں چائے آگئی اور وہ دونوں پینے لگیں۔ ساجدہ معذرت کرکے چلی گئی تھی۔

"امی جان کہاں ہیں ——؟" خورشید نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہوں گی —"

"کیسی ہیں ——"

"خیریت سے ہیں۔"

"اور ابا جان؟"

"وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تمہیں معلوم ہے وہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرونی ممالک آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب بھی وہ جاپان گئے ہوئے ہیں۔ کل ہی اُن کی خیریت کا خط آیا ہے —" صفیہ نے تفصیل بیان کی۔

"لیکن اب وہ اپنا کاروبار بیٹے کے سپرد کیوں نہیں کرتے؟ اُنھیں اب آرام کرنا چاہیئے —" خورشید نے پانسہ پھینکا۔ "جوان اولاد کس لئے ہوتی ہے۔"

"تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن طارق بھائی کی تعلیم تو مکمل ہو لے —؟!!"

"اُنھیں اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا کاروبار اب خود

سنبھالیں ——"

"ایم۔ اے کا آخری سال ہے۔ اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ امتحانوں سے زیادہ سے زیادہ چھ مہینوں میں فارغ ہو جائیں گے"، صفیہ نے اسے اطلاع بہم پہنچائی۔

"اچھا —— چلو تمہاری امّی سے تو مل لیں ——" خورشید نے چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ضرور —— وہ تمہیں دیکھ کر بڑی خوش ہوں گی ——"، صفیہ نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی —— دونوں امی جان کے کمرے کی طرف چل دیں۔

خورشید کو امّی جان سے ملنے کی کوئی خاص خواہش نہیں تھی وہ تو مختلف کمروں میں جھانک کر طارق کو دیکھنا چاہتی تھی کہ کہیں وہ دکھائی دے تو نظروں کی پیاس بجھے لیکن ناکامی ہوئی۔ وہ کسی بھی کمرے میں نہیں تھا۔ شاید باہر گیا ہوا تھا۔

"امّی جان خورشید آپ سے ملنے آئی ہیں۔" صفیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آؤ —— آؤ بیٹی سو بسم اللہ"

"اسلام علیکم خالہ جان ——"

"وعلیکم السلام —— کہو کیسی ہو ——"

"خیریت سے ہوں آپ اپنی کہیئے ——"

"کیا کہوں بیٹی —— ایک ہی جوان بیٹا تھا اور اُس نے بھی مسلسل، عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے ——"

"امی جان آپ نے کیسی باتیں شروع کر دی ہیں ——" صفیہ اگرچہ طارق کی مخالف تھی لیکن پھر بھی گھر کی بات کسی غیر کے آگے ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ لیکن بیگم صاحبہ تو شائد بھری بیٹھی تھیں اُنھیں تو شائد اس ذکر کے چھیڑنے کے لئے بہانے کی ضرورت تھی اور وہ اُنھیں مل چکا تھا۔

"تم چُپ رہو ——" اُنہوں نے صفیہ کو ڈانٹا اور خورشید کو مخاطب کر کے بولیں۔

"بیٹی کیا پوچھتی ہو —— قسمت کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ کاش میں بے حیاء طارق کو غیر لڑکی کے ساتھ مٹر گشت کرتے دیکھ کر مر گئی ہوتی"

"کون تھی وہ خالہ جان ——" خورشید ایک ہی کائیاں تھی اور اُس نے معاملے کا اندازہ کر لیا تھا اور اب اس کی کرید میں مصروف تھی۔

"نجانے وہ کون حرامزادی تھی۔ میرے سامنے آئے تو میں اُس کا مُنہ نوچ لوں۔ اور وہ کمینہ اسے اپنی دُلہن بنانا چاہتا ہے ——"

"خالہ جان اتنا غُصہ مناسب نہیں۔ آخر طارق صاحب اب جوان ہیں —— خود مختار ہیں ——" خورشید نے درپردہ چھری چلائی۔

"اس کی جوانی اور خود مختاری کو میں کیا سمجھتی ہوں۔ اس گھر میں

تو وہی ہوگا جو میں چاہوں گی ——" بیگم صاحبہ نے پھنکار کر کہا۔

" ہونا تو یہی چاہیئے ——" خورشید نے اور تیل چھڑکا۔

" لیکن آج کل زمانہ بدل چکا ہے اور میں نے اکثر بزرگوں کو اپنے بچوں کے سامنے سرنگوں ہوتے ہُوئے دیکھا ہے ——"

" میں مرجاؤں گی لیکن اس مردود کی ضد کے سامنے ہرگز ہرگز نہیں جھکوں گی۔" اُنھوں نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ " یہ میرا اٹل اور آخری فیصلہ ہے ——"

" توبہ توبہ —— کیسا زمانہ آگیا ہے۔ قیامت کے آثار ہیں کبھی یہ بھی ہُوا تھا کہ ——"

خورشید کی ان باتوں سے صفیہ نے اندازہ لگایا کہ وہ جان بوجھ کر امّی جان کو طارق کے خلاف بھڑکا رہی ہے اُس نے کافی دیر ضبط کئے رکھا لیکن آخر بول پڑی۔

" خورشید تم ہی موضوع بدلنے کی کوشش کرو۔ امّی تو خیر دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔"

خورشید نے دل میں سوچا —— " تمہیں کیا پتہ دل کے ہاتھوں میں اس وقت ان سے بھی زیادہ مجبُور ہُوں اور مجھے اپنے حُسن، جوانی اور ذہانت کی قسم میں طارق کو کسی دُوسری لڑکی کا ہرگز نہیں ہونے دُوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری امّی بیٹے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیں لیکن میں کسی اور ہی مٹی کی بنی ہُوئی ہوں جس نے آج تک ہزاروں کو کھلایا ہو وہ بھلا محبت

کے میدان میں مات کھا سکتی ہے۔"؟

"تم کیا سوچنے لگی ہو۔۔۔۔" صفیہ نے اُسے چُپ دیکھ کر کہا۔

"کوئی نئی بات۔۔۔۔" اُس نے ہولے سے کہا۔ طارق کی امّی اُس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ خورشید انھیں اسوقت بڑی اچھی لگ رہی تھی۔

"کاش یہ لڑکی میری بہو بن سکے۔" اُنھوں نے دِل ہی دل میں سوچا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

"خورشید کہیں تمہاری منگنی ہُوئی ہے یا نہیں۔"

"خالہ جان ابھی تک تو نہیں لیکن جلد ہی اُمید ہے۔"

"کیا کہیں رشتے کی بات چل رہی ہے۔۔۔۔"

"جی کئی۔۔۔۔ پیغام آئے ہیں اور۔۔۔۔" وہ ایک ہی کائیاں تھی اور بیگم قدیر کے سوال ہی سے اُنکے دل کی بات تک پہنچنے کی آرزومند تھی اسی لئے وہ اس انداز میں جواب دے رہی تھی کہ اگر وہ اُسے بہو بنانے کی خواہش رکھتی ہیں تو فوراً ہی دل کی بات زبان پر لے آئیں۔ لیکن بیگم صاحبہ بھی ایسی کم عقل نہ تھیں کہ وہ فوراً ہی پھٹ پڑتیں اس لئے اُنھوں نے سوال و جواب کا یہ قصّہ یہیں بند کر دیا۔

خورشید طارق کو تو نہیں دیکھ سکی تھی لیکن اُس نے اس کے گھر کے تمام حالات سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ اور اُسے اُمید بندھ چلی تھی کہ اگر وہ طارق کی بہنوں اور ماں کو اپنے ہاتھ میں کرلے تو اس کی کامیابی کے بہت زیادہ

امکانات ہیں، کچھ دیر بیٹھ کر وہ رخصت لے کر چلی گئی۔

خورشید کیلئے اب دن کا چین اور راتوں کا آرام حرام ہو چکا تھا، یہی خیال ہر وقت اُس کے تن بدن کو آگ لگائے رکھتا تھا کہ اس کا طارق کسی اور لڑکی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے۔ رہ رہ کر وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی، یہ اُس کی پرانی عادت تھی کہ جس وقت غصّے کی حالت میں ہوتی اور کوئی بات نہ سوجھ رہی ہوتی اس وقت زور زور سے اپنی ایڑی زمین پر مارنے لگتی تھی۔

اس دوران میں اُس نے ایکبار بھی اپنے بھائی سے سیدھے مُنہ بات نہیں کی تھی، اُس نے بھی زیادہ کرید نہیں کی تھی کیونکہ وہ اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور جب اُسے غصّہ یا پریشانی کے عالم میں دیکھتا تو کنّی کاٹ جاتا تھا۔ کہنے کو تو وہ بڑا بھائی تھا لیکن چلتی ہمیشہ خورشید کی تھی۔

"کروں تو کیا کروں ——" ہزاروں بار یہ فقرہ اُس کی زبان سے نکل چکا تھا۔ لیکن کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

کیوں نہ اس لڑکی کو اغوا کرا لیا جائے، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اس کے بعد طارق کو اپنی طرف متوجہ کرنا بیحد آسان ہو گا۔ حُسنِ صُورت اور دولت میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ لیکن آخر اُس لڑکی کا پتہ کیسے چلایا جائے اس کا ایک ہی طریقہ ہے صفیہ کو نادر کے جال میں پھنسا دوں۔ وہ خود ہی چکّر میں آ کر اس سلسلے میں کوشش کرے گی ورنہ اس

کا راز فاش کر دینے کی دھمکی ——— اُس نے اپنی اس مکروہ سوچ پر اطمینان کا سانس لیا اور اُٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

کپڑے بدلنے اور میک اپ میں آدھا گھنٹہ صرف کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی، اب اس کا ارادہ صفیہ کے گھر کا تھا۔ برآمدے میں ہی نادر سے آمنا سامنا ہو گیا۔

"شکر ہے آج تم بھی باہر نکلی ہو ———" وہ کئی روز سے اُسے کمرے میں بند پریشانی کے عالم میں دیکھتا رہا تھا۔

"ہاں۔ میں ذرا باہر جا رہی ہوں ———"

"کہاں ———"

"ایک سہیلی کے ہاں ———"

"مال دار آسامی ———"

"بیحد ——— حسین بھی" خورشید نے بڑی تمکنت سے بتایا۔

"لیکن بھیا میں چاہتی ہوں اُس سے تمہاری شادی ہو جائے۔"

"کیوں مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے ———؟" نادر نے حیران ہو کر پوچھا ——— وہ اپنی بہن کے منہ سے یہ الفاظ پہلی بار سن رہا تھا۔

اگر شادی نہ بھی کروانا چاہو تو اُس پر یہی ظاہر کرنا کہ اُس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے اور تم اُسی سے شادی کرو گے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی کچھ تصویریں حاصل کی جائیں۔

" جیسی تمہاری مرضی ——— مگر کیا کرو گی —"

" بلیک ———"

" دولت کیلئے ———"

" دولت کیلئے بھی اور ——"

" ہاں ہاں ——" نادر پوری دلچسپی لے رہا تھا۔

" اُس کے بھائی سے شادی کرنے کیلئے بھی "

" تمہاری مرضی ——" وہ اُس کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیا کرتا تھا۔

" اُسے کیسے بلاؤ گی ——"

" یہی سوچ رہی ہُوں ——"

" سالگرہ پر بلوا لو ——"

" وہ مارا ——— واہ بھیّا۔ اس طرح وہ بغیر شک و شُبہ کے آجائے گی۔" خورشید نے داد دیتے ہُوئے کہا۔

" ایسا شاندار ڈانس کرونگی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں گے ——— اور ہاں اُسے یہاں لانا میرا کام ہے اور شیشے میں اُتارنا تمہارا کام —— کیا سمجھے ——" نادر نے منڈیا ہلائی اور بولا "خوب سمجھ گیا۔ بس پارٹی کا بڑا شاندار انتظام کروں گا۔ لوگ مدّتوں اُس کو یاد کرتے رہیں گے۔ "

" بس ٹھیک ہے ——"

" اچھا ـــــــ ٹاٹا ـــــــ "

" ٹاٹا ـــــــ "

خورشید باہر نکل گئی۔ نادر اُسے کار میں کوٹھی سے باہر نکل کر جاتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت کسی گہرے معاملے پر سوچ رہا ہے۔

باب ۹

خورشید کے نقطۂ نظر سے یہ جشن بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ ہفتہ بھر پہلے سے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں، روپے کی کیا کمی تھی، دل کھول کر روپیہ خرچ کیا گیا۔ کوٹھی کے ہال کمرے کو بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ فرش آئینہ کی طرح چمک رہا تھا دیواروں کو بیش قیمت قالین کی مناسبت سے دو دنوں کے اندر اندر نیا رنگ دیا گیا تھا۔ قیمتی فانوس چھت پر لٹکے ہوئے ہے کسی انجانے دیس کا منظر پیش کر رہے تھے، رنگ برنگے غبارے اور کاغذی پٹیاں لٹک رہی تھیں جو خوبصورتی میں اور زیادہ اضافہ کر رہی تھیں۔

فرنیچر بڑے منفرد سٹائل اور بیش قیمت لکڑی کا تھا کاریگری کی نفاست کے کیا کہنے شائد وہ بنانے والے کے فن کی معراج تھی۔ کھانا پکانے کیلئے ماہر ترین باورچیوں کو منتخب کیا گیا تھا، اس سالگرہ کی تیاریاں بالکل اسی طرح کی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کسی بادشاہ یا ملکہ کی تاج پوشی ہونے والی ہو۔

دعوت کا وقت سات بجے کا رکھا گیا تھا۔ مہمان پانچ بجے سے آنے شروع ہو گئے تھے۔ خورشید اور نادر مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ خورشید اگر عورتوں میں ملکہ معلوم ہو رہی تھی تو نادر سردار تھا لیکن جو شائستگی خورشید کے انداز و اطوار میں تھی اس کا اکھڑ نادر میں کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔

مہمان مردوں اور خواتین کی نظریں خورشید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے سر پر ایک نہایت خوبصورتی سے بنا ہُوا پھولوں کا ہار پہنا ہُوا تھا۔ کھلے گلے کی قمیض کے ساتھ موتیوں کا جڑاؤ ہار عجب بہار دے رہا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے کنگنوں کے ساتھ ساتھ تازہ موتیے کے گجرے بھی پہن رکھے تھے۔ وہ اس وقت بالکل کسی نئی نویلی دلہن کی طرح لگ رہی تھی۔

اُس کی بے چین نظریں صفیہ کو ڈھونڈ رہی تھیں جو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ چھ بج چکے تھے۔ وہ فکرمند تھی اگر وہ نہ آئی تو آج کا سارا اہتمام بیکار چلا جائے گا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ خود جا کر اُسے لا نہیں سکتی تھی۔ ہال مہمانوں سے بھر چکا تھا اور اُنھیں یہاں چھوڑ کر چلے جانا اس کیلئے کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ اندر بیٹھے ہُوئے لوگ رنگ و نُور میں نہائے ہُوئے تھے اور شعر و بات سے جی بہلا رہے تھے۔ ہر طرف زندگی رقص کناں تھی۔

○

دوسری طرف صفیہ آنے کیلئے تو بالکل تیار ہو چکی تھی لیکن ابھی

تک اُس کیلئے کوئی تحفہ نہیں خرید سکی تھی، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ، خورشید کی سالگرہ پر دئے جانیوالے تحفے کا انتخاب ہی نہیں کر سکی تھی، چار بجے سے وہ تیار ہو کر گومگو کے عالم میں گھر کے مختلف کمروں میں چکراتی پھرتی رہی تھی کہ اس کا سامنا طارق سے ہوگیا۔ ایک لمحے کیلئے وہ گھبرا سی گئی طارق باہر جانے کیلئے تیار ہو کر نکل رہا تھا۔ صفیہ اُس سے بول چال بند کر چکی تھی لیکن گاہے گاہے اُس سے کسی موضوع پر ایک آدھ فقرہ کہہ سُن ہی لیتی تھی۔ اس وقت بھی اُس نے سوچا کہ اُس سے پوچھ ہی لیا جائے چنانچہ اُس نے اپنے آپ کو اچھی طرح سے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان ـــــ میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے۔ بتلائیے آج اُسے کون سا تحفہ پیش کروں ـــــ" اُس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"مجھے کیا معلوم ـــــ"، طارق نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"کسی اور کیلئے پوچھتی تو دیکھتی آپ کیا جواب دیتے ـــ"، اُس نے در پردہ طارق پر چوٹ کی۔

"آپ تو مجھ سے لڑنے کیلئے بہانوں کی تلاش میں رہتی ہیں ـــ" طارق نے اس کے اشارے کو سمجھ کر بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ذرا سا کام ـــــ"، صفیہ بڑی لجاجت سے بولی اُس میں مطلب کے وقت نرم ہو جانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

"آپ کا کیا بگڑے گا اچھی (Selection) سے پورے گھر کا تاثر اچھا ہو گا ـــــ اور بری سے برا۔ اس وقت میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ـــــ ورنہ کبھی نہ کہتی ـــــ"

"تحفہ کہاں سے لو گی ـــــ" طارق نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"انارکلی سے ہی ـــــ"

"چلو ـــــ"

ساجدہ کالج گئی ہوئی تھی۔ آج یہ دونوں بہن بھائی بڑے عرصے کے بعد اکٹھے باہر نکلے تھے۔ آج طارق نے گاڑی نکال لی۔ انارکلی میں بہت سی دکانوں کے چکر لگائے گئے اور آخر صفیہ نے ایک نہایت خوبصورت اور بیش قیمت ساڑی کو پسند کر لیا۔ پیکٹ لینے کے بعد وہ کار کیطرف بڑھے۔

"اب تم کیسے جاؤ گی۔ ـــــ"

"آپ مجھے میری سہیلی کے گھر تک چھوڑ آئیں ـــــ"

"لیکن مجھے بھی ایک کام ہے۔"

"تو میں کیا اکیلی جاؤں ـــــ"

"اچھا چلو ـــــ" طارق نے ہار مان لی ـــــ وہ بہنوں کی تکلیف کو اپنی ناراضگی کے باوجود برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کار جب ـــــ کوٹھی کے اندر داخل ہوئی تو پورچ میں کھڑی

ہوئی خورشید تقریباً دوڑ پڑی۔ دونوں بڑی بے چینی سے گلے ملیں۔

"اچھا۔۔۔۔ باجی میں چلتا ہوں۔"

پیشتر اس کے کہ صفیہ کچھ جواب دے۔ خورشید نے کہا۔

"صفیہ یہ کیا۔۔۔۔ اُنھیں بھی بلاؤ نا"

"وہ تو صرف مجھے یہاں چھوڑنے کیلئے آئے تھے" صفیہ نے ہولے سے بتایا۔ "یہ بھی پتہ نہیں کیسے ممکن ہوا۔۔۔"

نہیں نہیں اب میں ان کو ہرگز کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جانے دوں گی۔۔۔۔" خورشید نے گاڑی کیطرف طارق کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ طارق اس موقع پر آئے گا۔ اور جب وہ آہی گیا تھا۔ ناممکن بات ممکن ہو ہی گئی تھی تو پھر اس کو واپس جانے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اپنے آپکو کامیابی کے دہانے پر محسوس کر رہی تھی اُسے گھیر گھار کر روک ہی لیا گیا۔ صفیہ نے خورشید کے اصرار پر اُس سے بڑی لجاجت سے التجا کی تھی کہ وہ واپسی تک اُس کے ساتھ ٹھہرے کیونکہ رات کو وہ اکیلی گھر کیسے واپس جائے گی، یہ دلیل طارق پر اثر کر گئی اُس نے ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔ خورشید تو جیسے جھوم اُٹھی۔ اس نے نذیدوں کی طرح طارق کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور نگاہیں نیچے کئے ہوئے تھا۔

"بھیّا ان سے ملو یہ میری سہیلی خورشید ہیں جن کی سالگرہ ہے"

اُس نے خورشید سے اُس کا تعارف کرایا۔

" اور یہ میرے بھائی طارق-----"

" بڑی خوشی ہوئی ان سے مل کر-----" خورشید نے خلوصِ دل سے کہا وہ اپنی خوشی کو بشکل چھپا رہی تھی۔

اُنھیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ اندر لایا گیا۔ ہال کی فضا کو دیکھ کر صفیہ اور طارق ہکا بکا رہ گئے۔ ساڑھے چھ کا وقت تھا اور اندر کی تمام روشنیاں جلادی گئی تھیں، طارق اسوقت بڑا باوقار معلوم ہو رہا تھا۔ خورشید کی کئی سہیلیوں نے آنکھیں جھپکا کر اُسے دیکھا اور اشاروں کنایوں میں خورشید سے اُس کے متعلق دریافت کیا۔

" میری سہیلی کے بھائی ہیں------" وہ صرف اتنا کہہ کر رہ گئی حالانکہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہے۔

" یہ میرا محبُوب ہے-------- یہ میرا محبُوب ہے"۔

وہ سارا پروگرام بھول چکی تھی اور ہر حیلے بہانے طارق کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ البتہ نادر بڑی سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر پروگرام کے مطابق صفیہ سے کس طرح راہ رسم پیدا کرے کیونکہ طارق کی موجودگی میں یہ ناممکن سی بات معلوم ہو رہی تھی۔ صفیہ اپنے بھائی کے ساتھ ساتھ تھی کیونکہ اس کے قریب رہنے سے اس کی بڑائی تھی وہ اسوقت سب مہمانوں کی نگاہوں کا مرکز تھا اور ایسے شخص کی بہن کہلوانے کا اعزاز کسی طرح معمولی نہیں جو سب

کی نظروں میں نچ رہا ہو ——،

آخر کار رسومات کی ادائیگی کا آغاز ہوا، خورشید نے اٹھارہ شمعیں گُل کیں۔ تالیوں کے شور سے ہال گونج اُٹھا۔ اس کے بعد سالگرہ کے تحائف پیش کئے گئے پیکٹ کھولتے کھولتے ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ صفیہ کی ساڑھی کی بہت تعریفیں ہوئیں، خورشید نے صفیہ کا شکریہ ادا کیا۔

"تم نے تو کمال ہی کر دیا —— اتنی خوبصورت ساڑھی، میں اسے بڑی سنبھال کر رکھوں گی ——"

"یہ سب طارق بھائی کا کارنامہ ہے ——" صفیہ نے کنکھیوں سے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

"یہ پسند انھیں کی ہے ——"

"پھر تو میرے لئے یہ اور بھی قابلِ قدر شے ہے ——" خورشید نے ساڑھی کا پیکٹ سینے سے لگاتے ہوئے ناز سے کہا۔ طارق جھینپ سا گیا۔ خورشید کی فریفتگی اُس پر ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری عورتیں طارق کو شرماتے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں ۔ وہ اور زیادہ سُرخ ہو گیا

اب کھانے کا دور شروع ہوا —— نادر اور خورشید صفیہ اور طارق کے سامنے نئے سے نئے پکوان والی پلیٹیں رکھ رہے تھے۔

"یہ کباب لیجئے ——" خورشید نے کبابوں کی پلیٹ طارق کے سامنے سرکاتے ہوئے کہا۔

"انھیں تو آپ نے چکھا بھی نہیں"۔

"ابھی چکھتا ہُوں ـــــــ"

"شکریہ ـــــــ"

"آپ کا ـــــــ"

"ہمارے نصیب ایسے کہاں جو آپ کے شکریے کے لائق ٹھہریں"

"آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں ـــ"

"وہ کس طرح ـــــــ"

طارق نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ یہ لڑکی اسے زیادہ ہی آگے بڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔

طارق کو خاموش پا کر خورشید پھر بولی۔

"کیا ناراض ہو گئے ہیں آپ ـــــــ"

"جی نہیں ـــــ بلکہ شائد ہی کوئی آدمی ہو جو ہم سے ناراض نہ ہو" طارق کی زبان سے ایسے ہی نکل گیا۔

خورشید سمجھ گئی کہ اُس کا اشارہ اپنے گھر والوں کی طرف ہے موقع پا کر اُس نے بات آگے بڑھائی۔

"اُنھیں خوش کرنا بھی آپ کے بس میں ہے ـ"

"میرے بس میں ہوتا تو خوش کر چکا ہوتا۔"

"جی نہیں ابھی تو کچھ نہیں بگڑا۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں"

"میں کیا کر سکتا ہُوں ـــــــ" طارق نے بُجھے بُجھے لہجے میں کہا۔

"میری خدمات حاصل کر لیجئے ——" خورشید نے اشارتاً دل کی بات کہی لیکن طارق نہ سمجھا۔

"آپ کیا کر سکتی ہیں ——" طارق نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ کیا کروانا چاہتے ہیں ——"

طارق چونک پڑا۔ صفیہ کی ایک عزیز سہیلی اس کے کام آ سکتی تھی اور اگر وہ صفیہ کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر امی جان کا راہ پر لانا، ذرا بھی مشکل نہ تھا فساد کی جڑ تو صفیہ تھی جو امّی کے لئے بھڑکائے جانے کا موجب تھی اس کی خاموشی کے نتیجے میں ممکن تھا کہ امّی جان اپنی ضِد چھوڑ دیتیں اُس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"صفیہ باجی۔ امّی جان کو سمجھائیے کہ اپنی ضِد چھوڑ دیں ——"

"آپ کو شاید معلوم نہیں میں پُوری کوشش کر چکی ہُوں ——"

"پھر ——"

"ناکامی ——"

"طارق خاموش رہا ——"

"دیکھیں بزرگوں کا کہا مان لینا ہی بہتر ہے۔"

"اچھا ——" طارق کے لہجے میں اچنبھا اور طنز بیک وقت تھے۔ خورشید کٹ سی گئی۔

دوسری طرف صفیہ مصیبت میں مبتلا تھی۔ نادر اُس کے سر پر سوار تھا۔

"آپ اور چاول لیں گی ——"

"جی نہیں ——"

"یہ فرنی بڑی اچھی ہے ——"

"اس سے میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔"

"الائچی پیش کروں"

"میں خود ہر وقت ساتھ رکھتی ہوں"

نادر اُس کے مسلسل انکار اور بیزاری کے اظہار سے سرد سے پڑ گیا تھا اسے توقع ہی نہیں تھی کہ کوئی لڑکی اتنی ڈھیٹ بھی ہو سکتی ہے صفیہ نے اپنی، بیزاری کے اظہار کیلئے ایک اور چرکا لگایا۔

"خورشید صاحبہ کچھ نہیں کھا رہیں —— اُنھیں بھی پوچھیے۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو نادر صفیہ کو جان سے مار دیتا۔ صفیہ نے اُس پر اور اُس کی بہن پر بھرپور طنز کی تھی جسے وہ بس پی ہی گیا تھا۔

اچھا میں ہی اُسے کچھ کھلاتی ہوں —— " صفیہ جان چھوٹتے دیکھ کر بولی اور سرک کر طارق اور خورشید کے پاس چلی گئی۔

کھانے کے بعد رقص اور موسیقی کا پروگرام شروع ہوا۔ خورشید نے میوزک کلب سے کچھ سازندوں اور رقص کرنے والی لڑکیوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ اب اُنھیں نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کرنا تھا ہال میں نشستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ سٹیج سب کے سامنے پڑتا تھا۔

دو رقاصاؤں نے ناچ شروع کیا، بڑا دل خوش کن ناچ تھا وہ اس طرح ہال میں چکراتی پھر رہی تھیں جیسے چکوریاں چاند کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ اپنے فن میں اُن کی مشّاقی دیکھنے والوں سے بھرپور داد وصول کر رہی تھی۔ ان کے پاؤں فرش پر اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے دو مشینیں ہوں جنھیں ہمیشہ کیلئے متحرک کر دیا گیا ہو۔ اُن کے جسموں کی حرکت رگوں میں خون تیز کر دینے والی تھی۔ گاہے گاہے وہ اپنے سینے کے ابھاروں کو اس طرح نمایاں کرتیں کہ دل ڈول ڈول جاتے۔ کبھی وہ اپنے سروں کو پُشت کی طرف اتنا جھکاتیں کہ ایک کمان سی بن جاتی اور دیکھنے والوں کے دِلوں پر تیر سے چلنے لگتے۔

....

رقص کے بعد تھوڑی دیر کیلئے وقفہ ہُوا جس میں مہمانوں کو مشروبات پیش کئے گئے، خورشید کی چند سہیلیوں میں کھسر پھسر ہو رہی تھی انداز بڑا پر جوش تھا پھر ایک دم اُنھوں نے خورشید پر دھاوا بول دیا جو طارق اور صفیہ کے ٹیبل پر اُلجھی ہُوئی تھی۔

"اب تم ناچو........"

اس کی سہیلیوں میں سے ایک نے کہا۔ وہ بڑی مُنہ پھٹ تھی۔

"میں.....ناچوں....." خورشید بوکھلائی

"ہاں ہاں تم" دوسری نے اصرار کیا۔

"لیکن مجھے ناچنا کیا آئے گا۔"

"تم تو صرف نچانا جانتی ہو" پہلی نے چوٹ کی۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں

"یہ بہت اچھا ناچتی ہے ——" ایک رازدار نے دوسروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کراچی میں باقاعدہ تعلیم حاصل کر چکی ہے ——"

"نہیں —— نہیں"

"زیادہ نخرے نہ کرو اب ——" پہلی والی نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔

"اگر تم ناچو گی نہیں تو ہم سب واک آؤٹ کر جائیں گی ——" سب نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی تو خورشید کو مجبور ہونا پڑا۔

"اچھی بات —— اگر آپ کی خوشی یہی ہے تو میں تیار ہوں"

سب نے ہپ ہپ ہرّے کا نعرے بلند کئے۔ پھر وہ انھیں لباس تبدیل کرنے کو کہہ کر ہال سے نکل آئی۔ سلمہ اُس کے ساتھ تھی۔

"اری —— تو تم چھپی رستم نکلی ——"

"بس —— میرا تو جی نہیں چاہتا ——" خورشید نے بجھے دل سے کہا۔

"اتنے لوگوں کا اصرار ہے تو ضرور ناچو"

"تمہارے بھیّا تو ناراض نہیں ہوں گے"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں ——"

"تمہارا کیا خیال ہے ——"

"چھوڑو اس بات کو" صفیہ نے طرح دینی چاہی۔ وہ اس معاملے کو یاد کر کے ایسے موقعے پر طارق کے متعلق تلخ رویّہ اختیار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم لوگوں سے لباس تبدیل کرنیکو کہہ کر آئی ہو —— وہ انتظار کر رہے

ہوں گے"

"میرا دل ڈر رہا ہے ——"

"کس بات سے ——"

"کہیں وہ میرے اس طرح ناچنے پر ناراض نہ ہو جائیں"

"ہو سکتا ہے خوش ہی ہو جائیں" صفیہ نے بات ختم کرنے کیلئے کہا۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے"

"آمین —— اب چلو کپڑے بدلو" صفیہ نے اُسے گھسیٹا

خورشید ڈریسنگ روم سے باہر آئی، تو ایک لمحے کیلئے صفیہ کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ ناچ والے چست لباس پائجامے اور قمیض میں اس کے جسم کا ایک ایک خط نکھر آیا تھا اور وہ اتنی پر کشش لگ رہی تھی کہ دیکھنے والے کا دل اُسے آغوش میں لینے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا صفیہ نے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"خدا کی قسم آج تو ——"

"کیوں غلط فہمی میں ڈال رہی ہو ——" خورشید نے انکساری دکھائی۔

"جی چاہتا ہے تمہیں چوم لوں —— اتنی پیاری لگ رہی ہو۔"

"پھر چومتی کیوں نہیں ——؟" خورشید نے منہ پھاڑ کر کہا۔

"کل کو بھیا گلہ کرتے کہ میری امانت میں خیانت کیوں کی تھی۔؟"

چل ہٹ ــــــ گندی کہیں کی ،، خورشید نے اُٹھلا کر کہا صفیہ نے اُس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"اچھا اب بکلو مس شرافت بی بی ــــــ وہاں ہال میں لوگ تمہاری جان کو رو رہے ہوں گے ــــــ"

وہ ہال میں پہنچیں لوگ اُنہیں دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ مہمان مرد اور خواتین اُس کے بے انتہا خوبصورت سراپے کو دیکھ کر تعریف میں تالیاں پیٹ رہے تھے، خورشید جُھک جُھک کر شکریہ ادا کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد سکون ہو گیا اور سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

"دیکھئے جناب میں کوئی رقاصہ تو ہُوں نہیں" خورشید نے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔

"یہ آپ حضرات کی خواہش ہے جسے پُورا کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہُوں، بہر حال اگر رقص پسند نہ آئے تو یہ سمجھ کر معاف کر دیجئے گا کہ میں کوئی رقاصہ تو نہیں ہُوں"

"ٹھیک ہے ــــــ ٹھیک ہے ــــــ" عورتوں کی طرف سے آواز آئی ــــــ "ہم جانتی ہیں تم کیسا ناچتی ہو ــــ بھولی نہ بنو"

"خیر آپ کی عزت افزائی کا شکریہ۔" اُس نے خاص انداز سے سٹیج کے پچھلے حِصّے کی طرف بڑھتے ہُوئے کہا، سٹیج کے پیچھے پردہ آسمانوں کے منظر کے مطابق تھا۔ یُوں لگ رہا تھا کہ جیسے آسمان پر چمکنے والے بے شمار ستاروں

میں خورشید کا چہرہ چاند ہو ــــــ سازندے سٹیج کے دونوں کونوں میں بیٹھے تھے اور دیکھنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے ایک لمحے کیلئے اچانک ہال کی ساری بتیاں تاریک ہوگئیں۔ پھر ایک روشنی اسٹیج کے اوپر چھت سے پنتالیس کا زاویہ بنائے ہوئے خورشید پر پڑنے لگی۔ باقی سب ہال تاریک تھا۔ مہمان اپنی اپنی جگہوں پر مبہوت بیٹھے سامنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔

نیلا آسمان سامنے تھا جس میں ننھے ننھے تارے جھل مِل جھلمل کر رہے تھے خورشید ایک کمان کی صورت میں تنی ہوئی کھڑی تھی جیسے ابھی پرواز کر جانے کی سوچ رہی ہو۔

یکایک مردنگ کی آواز گونجی۔ جیسے آسمانوں میں بیٹھا ہوا کوئی دیوتا بجا رہا ہو ــــــ دیکھنے والوں کے سانس سینوں میں رک گئے، خورشید کا جسم لہریں لیتا ہوا حرکت میں آچکا تھا۔ وہ طبلے اور مردنگ کی تھاپ پر یوں، ہلکورے لے رہی تھی جیسے اُس کا جسم مکمل طور پر ہڈی کے بغیر بنا ہوا ہو۔ دُھن آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ اب اس میں رُباب اور دوسرے ساز بھی شامل ہوگئے تھے۔

پھر وہ اپسراؤں جیسی آن بان سے اِدھر سے اُدھر پرواز کرنے لگی، اُس کے قدم زمین پر لگتے ہوئے محسوس ہی نہیں ہوتے تھے بجلیوں بھرا وہ جسم پارۂ سیماب کے مانند ضوفشاں اور رواں دواں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کے بے کنار سمندر کی پُر اضطراب موجوں پر ایک آتش رنگ کشتی تیرتی، اُچھلتی اور ہلکورے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی وہ ہاتھ اُوپر اٹھاتی تو معلوم ہوتا جیسے وہ کشتی کا

باد بان ہے جو اُوپر اُٹھا ہُوا ہے نفاست سے بندھے ہُوئے گھرے کالے بادل کی لٹیں جیسے اس کشتی پر گھنگھور گھٹا بن کر چھائی ہُوئی تھیں، جوانی کا سنگھار، شباب کا پیمانہ، اس کی رسیلی چھاتیاں سینے کے جزیرے پر کپکپا رہی تھیں اُس کے تنفس اور جسم کی حرکت ہر آن اُن میں ایک مدّوجزر کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

اُس کی لپک اور تھرتھراہٹ نے دلوں کو گرما دیا سُرخ لباس میں شعلۂ جوالہ بنی ہُوئی وہ چاروں طرف اُڑتی پھرتی ہے۔ شائد ہی کسی نے اُس کے قدم اسٹیج پر لگتے ہُوئے محسوس کئے ہوں۔

دیکھنے والے بُت بنے بیٹھے تھے۔ وہ ایک مست ناگن کی طرح لہرا رہی تھی اور لوگ سحر زدہ اُس کی ہر حرکت کے ساتھ اپنی آنکھیں پھیر رہے تھے، سازوں کی آواز دُور آسمانوں سے آتی ہُوئی محسوس ہوتی تھی جس کی وجہ سے عجیب خوابناک سا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔

طارق ٹکٹکی باندھے اس آفتِ ایمان کو دیکھ رہا تھا خورشید کے حسن وجمال اور کشش کا یہ انداز کہاں دیکھا تھا، اُس کا دل خود بخود اُس کی طرف کھینچا چلا جا رہا تھا۔ وہ آنکھوں کے راستے اُس کے دل میں اُترتی چلی جا رہی تھی۔

”اگر میں نے رفعت سے عہد وپیمان نہ کئے ہوتے تو میں اس لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کر کے دم لیتا ـ ـ ـ“ وہ اپنے آپ میں بڑبڑایا۔ لیکن یہ الفاظ اُس کے ہونٹوں سے ذرا بلند نکل گئے جنہیں پاس بیٹھی ہُوئی صفیہ نے سُن لیا، وہ حیران رہ گئی اس کے بھائی کے دل کی برف پگھل رہی تھی۔

اس وقت اُس نے مداخلت مناسب نہ سمجھی اور چپ چاپ رہی وہ اس کی محویت میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

رقص کرتی خورشید کے ذہن میں اسوقت صرف ایک بات ۔۔۔۔
ایک جذبہ دھڑک رہا تھا جس کی تال پر وہ بیخود ہو کر ناچتی چلی جا رہی تھی وہ جذبہ یہ تھا کہ کاش وہ طارق کے دل میں گھر کرے اُسے ہال میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کی موجودگی کا احساس نہیں تھا اس کی نظر صرف طارق پر تھی۔ جو اس کے خیال میں ایک دیوتا کی طرح مسند پر براجمان تھا اور وہ ایک پُجارن کی طرح اپنی محبّت اور فن کی کلیاں اس کے قدموں پر نچھاور کر رہی تھی۔ یہ رقص اُس کیلیے عبادت کا درجہ حاصل کر گیا تھا۔ اُس کے جسم کے ساتھ ساتھ اُس کی رُوح بھی اس رقص میں شامل تھی اور یہ ناچ جسم اور رُوح کے سنگھم پر ہو رہا تھا اور اپنی عظمت کا خراج بے خود تماشائیوں سے اچھی طرح وصول کر رہا تھا۔

وہ تھکن سے چور ہو چکی تھی، پسینہ اُس کے جسم سے پھوٹ رہا تھا۔

لیکن وہ بدمستی اور مدہوشی کے عالم میں مسلسل ناچے چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے من جوبن کو اُبھار رہی تھی۔ یہ رقص اُس کیلئے التجائے نیاز بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ پریتم کے حضور میں اپنے جسم وجان کا نذرانہ پیش کرنا چاہتی تھی۔

اُس کی نگاہیں اپنے مقصود پر جمی رہیں اور جسم تھرکتا رہا۔

طارق اس سحرِ مجسّم، آتشِ پیکر کے حُسنِ جاں سوز کا دیوانہ بنتا

چلا گیا۔

پھر رقص تھم گیا۔

زمین و آسمان کی گردش جیسے رُک گئی۔ خورشید سٹیج ہی پر طارق کی کرسی کے سامنے جو پہلی لائن میں اُس سے کوئی دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھی، ڈھیر ہوگئی، تھکن نے اُس کے بند بند کو جکڑ لیا تھا۔

لوگ دس منٹ تک مسلسل تالیاں پیٹتے رہے۔ اُنھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اُنھوں نے اپنی فانی آنکھوں سے ایسا رقص دیکھا ہے جسے صرف دیوتاؤں کا مقدر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ اُس کے سامنے خورشید نہیں بلکہ کوئی دیوی ناچتی رہی ہے۔

مگر کیا خورشید کسی دیوی سے کم خوبصورت تھی۔

اگلی قطار والے کئی افراد دوڑ کر سٹیج پر پہنچ گئے جہاں خورشید بے سُدھ پڑی ہُوئی تھی ان میں صفیہ اور طارق بھی تھے، صفیہ نے سہارا دے کر اُسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔

"خورشید —— تمہارے فن کی کیا تعریف کی جائے۔ ایسا لافانی رقص میں نے کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا ——"

"شکریہ صفیہ ——"

چاروں طرف سے مہمانوں نے اُنہیں گھیر لیا۔

"خدا کی قسم خورشید ملک کی سب سے اچھی رقاصہ ہیں ——"

"یہ تو چھپا رستم نکلیں ——"

"ارے یہ تو آسمانی اپسرا ہیں ——"

"شکریہ — شکریہ ——" دیر تک خورشید مہمانوں سے داد وصول کرتی رہی ۔ —— مردوں میں سے۔ کچھ کی داد میں دعوت اور التجا کا انداز بھی شامل تھا لیکن ، اُس نے کسی کو بھی آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ شور کم ہُوا تو لوگ رخصت ہونے لگے۔ خورشید اُنھیں دروازے پر رُخصت کرتی رہی۔ آخر میں طارق اور صفیہ رہ گئے۔

"اچھا بھئی اب ہمیں بھی اجازت دو"

"چند منٹ بیٹھو تو سہی ——" وہ اُنھیں ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

"آپ نے رقص کس سے سیکھا ہے ——" طارق نے سوال کر ہی دیا وہ بڑی دیر سے یہ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کے خیالات آڑے آرہے تھے۔

"جی —— شمبھوجی مہاراج سے ——"

"وہ تو کتھاکلی کے بہت بڑے ماہر ہیں ——"

"جی ہاں —— ساری دُنیا انھیں جانتی ہے ——"

"آپ پر اُنھوں نے خاص محنت کی ہے ——" طارق نے بھرپور طریقے سے داد دیتے ہُوئے کہا۔

"جی نہیں —— میں ان کی نالائق ترین شاگردوں میں سے ایک ہُوں ——" خورشید نے خلافِ معمول انکساری سے کام لیا۔

"فن کاروں کو انکسار ہی زیب دیتا ہے ——"، طارق نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن بلا مبالغہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پورے ملک میں آپ جیسی ماہر فن شائد ہی کوئی دوسری رقاصہ ہو ——"

"جی شکریہ ——" خورشید کو اس کی ساری محنتوں کا ثمر مل گیا تھا خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ کی داد نے میرا دل بڑھا دیا ہے ——"

"لیجئے میں کیا اور میری داد کیا۔"

"آپ کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اس فن کی باریکیوں سے واقف ہیں ——"

"جی نہیں صرف معمولی شد بد رکھتا ہوں"

خورشید نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ صرف اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ ایک بھرپور جذبہ —— ایک گھمبیر احساس لگاؤ کا جذبہ ہے جو کوئی بھی روپ دھار سکتا ہے صفیہ انہیں اکیلا چھوڑ کر ہٹ گئی تھی۔ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ گفتگو کا موقع دینا چاہتی تھی۔ طارق بھی اپنے جذباتی، نقطۂ نظر کو بھول کر خورشید سے گفتگو میں لگا ہوا تھا۔

"آپ تو کبھی ملتے ہی نہیں ذرا فن پر گفتگو ہی چلا کرے" خورشید نے من موہ لینے والے انداز میں گلہ کیا۔

"گلہ مجھے کرنا چاہیئے نہ کہ آپ کو"

"کیوں ——" خورشید کھل اُٹھی۔

"آپ نے مجھے مدعو کب کیا"

"اس غلطی کو ابھی تک معاف نہیں کر سکے آپ" اُس نے بیچارگی سے کہا۔ طارق کا دل ڈول ڈول گیا۔

"بھئی میں معاف کرنے والا کون ——" طارق کے لہجے میں کھلنڈرا پن تھا۔

"میرے لئے تو آپ ہی سب کچھ ہیں ——" خورشید نے دل کی بات کہہ ہی دی، وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ طارق سکتے میں آگیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ" اُس کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

"کیوں ——"

"دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا ضروری ہے ——"

"مجھے اپنی جان کی قسم طارق صاحب اگر میں جھوٹ بولوں۔ اب تو یقین کرلیں ——" خورشید نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ وہ صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھانا جانتی تھی۔

طارق اس کی بات پر ہنسنے لگا۔ وہ اس سلسلے میں سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے عہد کا وفادار آدمی تھا اور رفعت سے وہ عہد ہی نہیں۔ چکا تھا بلکہ سچے دل سے اُسے پیار بھی کرتا تھا وہ اس وقت خورشید کے گھر میں موجود نہیں تھی تو کیا ہُوا۔ وہ اس کے دل میں تو موجود تھی۔!

" باجی چلو گھر چلیں ــــــ "، طارق نے گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے صُفیہ کو مخاطب کیا۔

" یہاں سے اکتا گئے ہیں ــــــ " خورشید درمیان میں بولی

" گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے "

صفیہ بھی اس دوران میں اُن کے پاس پلٹ آئی تھی۔

" ہاں بھئی ــــــ بھیّا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ گیارہ بج رہے ہیں " اُس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

" چلئے پھر میں آپ لوگوں کو گھر چھوڑ آؤں "۔

" آپ تکلیف کیوں کرتی ہیں ــــــ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔ "

" یہ تکلیف نہیں عینِ راحت ہے ـــ "

" طارق کیوں ضد کر رہے ہو ــــ "، صفیہ نے کہا اور وہ چُپ ہو گیا۔

لیکن تم واپس کیسے آؤ گی ---"

تمہاری گاڑی ہی لے آؤں گی۔ صُبح نوکر دے جائے گا۔ ہماری، گاڑی ایک مہمان کو چھوڑنے کیلئے جا چکی ہے۔ "

" اچھا تو چلو پھر ــــ " صفیہ نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ طارق بھی ساتھ ساتھ تھا۔

واپسی پر خورشید بے حد مسرور تھی وہ اپنے خیال کے

مطابق کامیابی کی منزل کا نصف راستہ طے کر چکی تھی۔

باب ۹

صفیہ پہلے ہی سے خورشید سے متاثر تھی اور اُسے اپنی بھابی بنانا چاہتی تھی۔ سالگرہ والی بات واپسی پر طارق نے خورشید میں جس دلچسپی کا اظہار کیا تھا اُس کی بنا پر اُس کے دل میں یہ خواہش زیادہ ہوگئی تھی کہ اپنی سہیلی اور پسند کیلئے زیادہ کوشش شروع کردے۔ چنانچہ اس نے گھر میں اپنی امّی کے سامنے اُس کی تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کردئے جس کی وجہ سے امّی جان بیحد متاثر ہوکر اس بات پر مکمل طور پر تُل گئیں کہ وہ خورشید ہی کو اپنی بہو بنائیں گی۔

اب صورتِ حال زیادہ نازک ہوگئی تھی۔ پہلے کوئی جواز نہ تھا کہ طارق اُن کی پسند کو ٹھکرا رہا ہے۔ اب یہ جواز بھی ہاتھ آنے کا امکان تھا بیگم صاحبہ خورشید کے حُسن وجمال اور نام نہاد سلیقہ مندی اور ہوشیاری کی معترف ہوگئیں۔

طارق نے یہ سارا معاملہ ساجدہ کے سامنے بھی پیش کردیا تھا وہ

سنتے ہی تڑپ اٹھی۔

"مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ امّی اور صفیہ ایسا گُل ضرور کھلائیں گی"

"تم بیفکر رہو میں اتنا کچّا نہیں ہُوں۔ وہ اپنی پسند کو لئے پھریں میرا اپنا فیصلہ اٹل ہے ـــــــ" طارق نے اُس پر اپنا خیال ظاہر کیا۔

"سچ بھائی جان آپ کو اب رفعت سے کبھی مُنہ موڑنا نہیں چاہیئے ـــــــ اور وہ اب ابّا جان بھی کل واپس پہنچ رہے ہیں۔ ان کا تار آیا ہے ـــــــ!" ساجدہ نے اسے اطلاع دی۔

"شکر ہے خدا کا ـــــ" طارق نے اطمینان کا سانس لیتے ہُوئے کہا۔

"کم از کم گھر کے کھنچاؤ میں تو کمی آئے گی"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ابّا جان کے آتے ہی رفعت کے متعلق اُن سے بات کروں گی۔"

"لیکن مجھے ڈر ہے کہ امّی جان اور صفیہ خورشید کی شہ پر کوئی جھگڑا نہ کھڑا کر دیں ـــــ" طارق نے متفکّر ہوتے ہُوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا ـــــ" ساجدہ نے پُریقین انداز میں کہا۔

"آپ رفعت سے ملنے کا کوئی بندوبست کریں، میں اُسے بہت کچھ باتیں سمجھا دوں گی ـــــ"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا ـــــ" طارق نے پوچھا۔

" وہ ان لوگوں کیطرف سے محتاط رہے گی اور کسی قسم کی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوششوں میں پانی پھر جائے گا۔"

" یہ ٹھیک ہے ——— میں جلد ہی اُس سے تمہاری ملاقات کا انتظام کروں گا ——"

دُوسرے روز قدیر صاحب تشریف لے آئے۔ سارا گھر ہوائی اڈے پر اُن کو لینے کیلئے گیا ہوا تھا۔ قدیر صاحب نے رستے ہی میں محسوس کرلیا تھا کہ گھر کو جس جذباتی کشمکش کی حالت میں چھوڑ کر وہ یہاں سے گئے تھے وہ ابھی تک اُسی حالت میں ہے اس کا انھیں دِلی افسوس ہُوا لیکن فی الحال اُنھوں نے کسی قسم کی گفتگو شروع کرنے سے گریز کیا۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت وہ تنہا بیگم کے ساتھ بیٹھے تھے موقع مناسب دیکھ کر اُنھوں نے بات شروع کی۔

" معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کا اختلاف ابھی تک رفع نہیں ہُوا۔" انھوں نے بڑے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

" آپ سفر کی تکان تو اُتاریں ——— یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی ——"

بیگم صاحبہ کو آخر اپنے شوہر سے محبّت بھی تھی وہ اُن کو طویل وقفے کے بعد ملے تھے اس لئے بات چیت میں کسی قسم کی تلخی یا سختی کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑے نرم لفظوں میں اُن کے سوالوں کو

کو ٹال دیا۔

"میں بالکل تھکا ہُوا نہیں ہُوں —" قدیر صاحب بولے۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

"البتہ تم کچھ کمزور نظر آ رہی ہو —"

"آپ کے جانے کے بعد تو میری صحت مسلسل گرتی گئی ---- صدمہ معمولی تو نہ تھا —" بیگم صاحبہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہُوئے کہا۔

"بھئی صدمہ کیسا —"

"آپ نہیں جانتے —؟"

"اچھا تو تم طارق والی بات کر رہی ہو۔ پگلی وہ تو خوشی کی بات تھی نہ کہ صدمے والی۔ میں نہ سمجھتا تھا کہ تم اس بات کو اتنا طول دو گی" قدیر صاحب کی آواز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"آپ تو اس کی حمایت پر کمر باندھے بیٹھے ہیں —" بیگم صاحبہ نے تلخی سے کہا —

"طرفداری کیسی، میں چاہتا ہُوں کہ میری اولاد پڑھ لکھ کر اپنی عقل اور سوجھ بوجھ کو استعمال کر کے اپنی زندگی بسر کرے نہ کہ اُنھیں پڑھانے سے میری غرض یہ تھی کہ وہ بالکل لکیر کے فقیر بنے رہیں۔ ہمیں ان کی آزادی میں قطعاً کوئی خلل نہیں ڈالنا چاہیئے" قدیر صاحب ایک ہی سانس میں کہتے چلے گئے۔

"اور پھر یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے، اس میں تو انھیں اپنی پسند و ناپسند کے معاملے میں مکمل خود مختاری حاصل ہونی چاہیئے، میرا تو خیال تھا کہ ہم طارق کی شادی اُس کی پسند کے مطابق کر دیں اُنھوں نے بیگم کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے ــــــ" بیگم صاحبہ نے تنک کر جواب دیا۔

"تو کیا تم طارق کی منگنی کے سلسلے میں بات کرنے کے لئے میرے ساتھ نہیں چلو گی ــــــ" قدیر صاحب نے استعجاب سے پوچھا۔

"آخر تم اس کی ماں ہو ــــــ"

"میں کسی کی ماں واں نہیں ہُوں ــــــ"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے ــــــ" قدیر صاحب نے کڑی نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"بالکل ــــــ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی ــــــ"

"بہتر ــــــ" قدیر صاحب اُٹھتے ہوئے بولے۔

"میں اس معاملے میں اب تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ باپ کی حیثیت سے مجھ پر جو طارق کیلئے فرائض عائد ہوتے ہیں انھیں پورا کرنا میرا فرض ہے، میں اس کی آرزوں اور اُمنگوں کے سامنے دیوار نہیں بن سکتا اس لئے وہی کروں گا جو وہ چاہتا ہے۔ لیکن تم اس سلسلے میں اپنی ضد پر قائم رہ کر کتنی بڑی غلطی کر رہی ہو ــــــ اس کا اندازہ تمہیں

کچھ عرصہ ٹھہر کر ہوگا ـــــــ"

بیگم صاحبہ گم سم بیٹھی رہیں انھیں اپنے محبت کرنے والے خاوند سے اس بات کی قطعاً توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی مرضی کو ٹھکرا کر بیٹے کا ساتھ دے گا۔ ان کی اس بے تعلقی نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اور وہ سسکیاں لینے لگیں۔ قدیر صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

وہ کافی دیر سے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ گفتگو بیگم صاحبہ کی ضد سے ٹل کر اب براہِ راست منگنی کے موضوع پر آگئی تھی۔

"تو پھر کل چل رہے ہیں نا آپ" ساجدہ نے قدیر صاحب سے پوچھا وہ طارق کی منگنی کے سلسلے میں زیادہ سرگرمی دکھا رہی تھی۔

"کیوں نہیں... ہم کل اپنے بیٹے کے رشتے کی بات پکی کر کے آئیں گے لیکن ساجدہ کیا ان لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔" قدیر صاحب نے ذرا احتیاط کے مدِ نظر سوال کیا۔

"بالکل کوئی اعتراض نہیں ہوگا ابا جان، میں اُن کے گھر والوں سے مل چکی ہوں ـــــــ وہ سب لوگ راضی ہیں ـــــــ"

"پھر تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اچھا تو کل کس وقت چلا جائے"

"شام کا وقت مناسب رہے گا ـــــ"

"ہاں ـــــــ یہ ٹھیک ہے"

"منگنی پر ہمیں کیا کچھ لے جانا چاہیے ـــــ" قدیر صاحب بولے

"یہی کچھ مٹھائی وٹھائی وغیرہ اور لڑکی کیلئے لباس۔ اس کے علاوہ انگوٹھی وغیرہ بھی ہونی چاہیئے ——" ساجدہ نے بتایا،

"اور میرے خیال میں ساڑھی اچھی رہے گی کیوں کہ بھابی ساڑھی کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ——"

"ٹھیک ہے تو پھر تم دونوں بہن بھائی چیزیں خرید لاؤ۔"

"جی نہیں ——" ساجدہ نے کہا —— "بھیا کا اب اس معاملے سے تعلق نہیں۔ یہ چیزیں آپ اور میں جا کر لائیں گے۔"

"لیکن بھئی وہ دلہن کی پسند ——"

"دلہن کی پسند کو ایک طرف رہنے دیجئے۔ یہ تو آپ کا اور میرا امتحان ہے کہ ہم ایسی چیزیں لیں جس کو لازمی طور پر پسند کیا جائے ——" ساجدہ نے پیار سے کہا۔

"ہاں —— یہ ٹھیک ہے تو چلو اٹھو —— انارکلی چلیں ——"

"چلیں ——" ساجدہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ طارق اور قدیر صاحب نے بھی اس کا ساتھ دیا طارق اس وقت ان سے الگ ہو کر رفعت کو خوشخبری سنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے رخصت چاہی۔

"ہاں —— تم جاؤ —— تمہارا کوئی دوست منتظر ہو گا" قدیر صاحب نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ طارق نے شرما کر سر جھکا لیا۔

ساجدہ اور قدیر صاحب ہنستے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

وہ تقریباً اُڑتا ہوا ہوٹل میں پہنچا تھا۔ رفعت کمرے میں بیٹھی اُس کی منتظر تھی۔

"میری جان ـــــ میری زندگی،" اُس نے بے تابی سے اُسے گلے سے لپٹاتے ہوئے کہا رفعت اُسے اس قدر خوش دیکھ کر سمجھ گئی کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے۔

"کیا بات ہے میری جان ـــــ آج تو چہرے پر گلاب کھل رہے ہیں۔" رفعت نے والہانہ انداز سے کہا۔

"کل ابا جان تمہارے گھر جائیں گے ـــــ" اُس نے اشارتاً بتایا

"سچ ـــــ جان ـــــ میری قسم"

"ہاں ـــــ میری جان بالکل سچ ـــــ اپنی امّی اور ابّا جان کو اطلاع کر دینا ـــــ" طارق نے اس کی تھوڑی کو اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ رفعت کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی تھی۔ دیر تک وہ ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے، بیٹھے آنے والے حسین دنوں کا پروگرام بناتے رہے۔

طارق گھر واپس پہنچا تو قدیر صاحب اور ساجدہ خریداری کے بعد واپس بھی آ چکے تھے۔ ساجدہ نے اُسے دیکھ کر بُلایا۔

"بھیّا اِدھر آئیں دیکھیں ہم کیا کچھ لے کر آئیں ہیں —— "اس نے شریر لہجے میں طارق کو مخاطب کیا۔

"لو بھئی دیکھ لو —— ہماری پسند کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" قدیر صاحب نے طارق کو دیکھ کر کہا۔ وہ صوفے پر بیٹھے ساجدہ کو چیزیں رکھتے ہوئے دیکھ رہے تھے ساجدہ نے بکس سے ساڑھی اور انگوٹھی دکھائی۔ ساڑھی بیحد نفیس اور امپورٹڈ تھی۔ انگوٹھی میں اصلی ہیرا جگمگا رہا تھا طارق کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں، اُسے اپنے والد کی محبّت اور شفقت پر پیار آ رہا تھا۔

"تم تو چُپ ہی ہو گئے —— " قدیر صاحب نے دوبارہ اسے مخاطب کیا ——

"کیا خیال ہے ہماری بہو ان چیزوں کو پسند کرے گی یا نہیں"

"کیوں نہیں جناب —— " طارق نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"آپ کا انتخاب بے مثل ہے —— "

"خدا کا شکر ہے —— میں تو ڈر ہی رہا تھا کہیں صورتِ حال اس سے مختلف نہ ہو —— "

"امّی جان نے یہ چیزیں دیکھیں " طارق نے سوالیہ نظروں سے ساجدہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اُن کو ان کی نظر نہ ہی لگے تو اچھا ہے —— "قدیر صاحب نے جواب دیا۔ وہ ایسے ہی آدمی تھے۔ اصولوں پر وہ اپنی زندگی کی

عزیز ترین چیزوں کو وار دینے میں ذرا بھی تعمل نہیں کرتے تھے اور یہ بات تو عین ان کے نظریئے کے مطابق تھی کہ اولاد کو اس کی مرضی کے مطابق شادی کا حق دینا چاہیئے۔ اس اصول کے لئے انھوں نے اپنی محبوب بیوی کی ضد کو بھی کوئی اہمیت نہ دی تھی اور اپنے بیٹے کیلئے ڈھال بن گئے تھے۔

" اباجان ایک بار تو انھیں دکھا دیں نا " ساجدہ نے اصرار کیا۔

" وہ کیا سوچیں گی ــــــ "

" ہرگز نہیں ــــــ " قدیر صاحب سخت لہجے میں بولے۔

" اب انھیں اس معاملے میں کسی قسم کا حق نہیں رہا۔"

ساجدہ چُپ ہوگئی۔ قدیر صاحب اپنی ہٹ کے پکے تھے اس لئے اُن سے بحث بیکار تھی۔

" ہاں بھئی۔ پھر وہ ہم کل کس وقت رفعت کے گھر جائیں" قدیر صاحب نے طارق سے پوچھا۔

" جی کل شام پانچ بجے کا وقت مناسب رہے گا، اُس وقت سب لوگ گھر پر موجود ہوں گے" طارق نے سر جھکا کر جواب دیا۔ وہ اپنی خوشی کو چھپا کر سنجیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔

" اچھا بھئی ــــ اب معاملہ کل کا رہ گیا۔ آج مجھے کچھ دوستوں سے ملنا ہے

کھانا ایک میٹنگ میں ہے۔ اس لئے رات دیر سے آؤں گا۔

اچھا ـــــــ خدا حافظ ـــــــ "

"خدا حافظ ـــــ " طارق اور ساجدہ نے بیک زبان کہا۔ قدیر صاحب باوقار انداز میں قدم اٹھاتے ہُوئے باہر نکل گئے۔

ایک رات طویل ہی کتنی ہوتی ہے۔ آدمی اطمینان سے بستر پر لیٹتا ہے اور جب آنکھ کھلتی ہے تو ایک دن ختم ہو چکا ہوتا ہے اور دُوسرے کی ابتداء ہو چکی ہوتی ہے۔ صرف چند گھنٹوں پر محیط یہ رات بغیر کسی پریشانی کے گزر جاتی ہے پھر ـــــــ؟

لیکن یہ رات طارق اور رفعت کیلئے زندگی کی طویل ترین رات تھی اپنے اپنے گھروں میں بستروں پر لیٹے ہُوئے وہ دونوں بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کا آرام و سکون کوئی چھین کر لے گیا ہے اور بے چینیاں اور اضطراب ان کے حوالے کر گیا ہو۔ یہ الگ بات تھی کہ اس اضطراب اور بے چینی میں غم کا عنصر نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی خوشی کے انتظار کی چبھن تھی جو کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس رات کی صبح کا سورج اپنا راستہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے اور اب صبح کی آمد کا کوئی امکان نہیں جسطرح بچے بسنت کی رات پتنگوں میں تناویں ڈال کر تیار رکھتے ہیں۔ یا لڑکیاں عید والی رات اپنے ملبوسات بنا سنوار کر رکھتی ہیں اور رات بھر اطمینان

سے سونا ان کیلئے ناممکن ہو جاتا ہے اسی طرح طارق اور رفعت کو بھی آنے والے دن کا شدّت سے انتظار تھا۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور دور دور تک اس کی آمد کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

جن لوگوں نے محبّت کی ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ طارق اور رفعت اس معاملے میں مجبور تھے محبّت اگر لذّت بخش ہے تو اتنی ہی تکلیف دہ بھی ہے۔ ایک لمحہ اگر یہ خوشی کے پھول نچھاور کرتی ہے تو دوسرے ہی لمحے اشکوں کی لڑیاں بھی پروئی جانے لگتی ہیں اور بعض اوقات تو غم اور خوشی کا اتنا عجیب سنگم ہوتا ہے کہ خوشی کے موقع پر آنسو بہنے لگتے ہیں اور غم کی شدّت ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے

بہر حال کوئی ایسی رات نہیں ہوتی جس کی سحر نہ ہو اس رات نے بھی آخر کار اپنا ساز و سامان اُٹھایا۔ اور دن کیلئے جگہ خالی کر دی۔ سورج نکلا تو طارق نیند کے زبردست حملوں کی تاب نہ لا کر خوابوں کی دنیا میں کھو چکا تھا۔ ماجدہ دو بار اس کے کمرے میں آئی اور اسے سوتا ہوا دیکھ کر واپس چلی گئی، اسے معلوم تھا رات اس کا بھائی ایک پل کیلئے بھی سو نہیں سکا ہو گا۔ اس لئے اب وہ پوری نیند ہی لے کر جاگے گا۔

دو بجے کے قریب وہ جاگا اور وقت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ انتظار کا طویل وقت گزر چکا تھا۔

"جاگ رہا ہوتا تو اس وقت تک سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوتا"

طارق نے اپنے آپ سے کہا اور ساجدہ کے کمرے میں گیا، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کنگھی کر رہی تھی۔

"بھیّا ——— آج تو آپ گھوڑے خچر سب کچھ بیچ کر سوئے۔" اس نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی ——— کہیں صبح کے قریب آنکھ لگی تھی ——— نیند پوری ہونے پر ہی آنکھ کھلنی تھی۔"

"اچھا بھیا۔ اب ہم لوگ تو جا رہے ہیں۔ آپ کہاں رہیں گے" ساجدہ نے بال باندھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تیار ہو کر باہر کسی دوست کے پاس نکل جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بھیّا اس طرح وقت آسانی سے گزر جائے گا۔"

"چل بھاگ شریر کہیں کی ———" طارق نے پیار سے اُسے ڈانٹا اور باہر نکل گیا۔

تیار ہو کر اُس نے آئینہ میں خود پر نظر ڈالی اور ہنس پڑا۔ اپنا عکس اس وقت اُسے بڑا پیارا لگا تھا۔ ہنستا ہنستا وہ کمرے سے باہر نکلا تو قدیر صاحب دکھائی دیئے جو ساجدہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ایک عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھے

"سلام ابّا جان ———" اُس نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وعلیکم اسلام۔ کہو بیٹے کیسے ہو" وہ اسکی طرف آگئے اُنکی نظر اسکے سراپا پر تھی

"ابّا جان کیا دیکھ رہے ہیں آپ ــــــ" طارق نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"جب میری شادی ہوئی تھی تو میں بھی بالکل تم جیسا ہی تھا۔ ذرا میری پرانی تصویریں تو دیکھنا ــــــ"

"میں اکثر اُنھیں دیکھتا رہتا ہوں ابّا جان۔ کئی بار تو وہ مجھے دھوکے میں ڈال دیتی ہیں۔"

"دھوکہ کیسا بٹیا! ــــــ" قدیر صاحب نے پیار سے اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"باپ اپنے بیٹے کے رُوپ میں دوبارہ جنم لیتا ہے۔ میں اور تم دیکھنے میں دو ہیں ورنہ اصل میں ایک ہی چیز ہے۔"

طارق ان سے بے تحاشا لپٹ گیا اتنی شدید اپنائیت اُسے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، آنسو اس کی آنکھوں سے چھلکنے ہی والے تھے۔

"بیوقوف" قدیر صاحب نے اس کے جذبے کو سمجھتے ہوئے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"آؤ چلیں ــــــ"

تھوڑی دیر کے بعد ساجدہ اور قدیر صاحب اپنی گاڑی میں چلے گئے طارق دُور تک اُنھیں دیکھتا رہا اور پھر ٹرک پر آگیا۔ اس کی بھوک ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی اور اس وقت کسی ہوٹل ہی میں

یہ آگ بجھائی جا سکتی تھی۔

رفعت کے گھر میں اس وقت بڑی چہل پہل تھی۔ ڈرائنگ روم کو خوب سجایا گیا تھا اور اس سجاوٹ میں خود رفعت نے سب سے بڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اپنا دل نکال کر بھی اس میں رکھ دیتی آج اس کے محبوب کے والد اسے مانگنے کیلئے آرہے تھے ——— اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی، اُس کے دل کی ہر دھڑکن طارق طارق پکار رہی تھی۔ آج کا دن اُس کی زندگی کا اہم ترین، دن تھا۔

" نرگس مجھ سے تو کھڑا ابھی نہیں ہُوا جاتا" رفعت نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔

" تو کھڑی کیوں ہیں ملکہ صاحبہ ——— بیٹھ جائیے یا لیٹ جائیے"
وہ تنک کر بولی۔ بہن سے انتہاہ پیار کے باوجود وہ چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتی تھی۔

" رک کیوں گئی ہو ——— اور کچھ بھی کہو ——"

" میں اپنا بھیجا مفت میں کیوں کھپاؤں"

" تم پر بھی یہ وقت آئے گا ———" رفعت نے کٹ کر کہا۔

" اس روز گن گن کر بدلے اُتاروں گی۔"

" ضرور ضرور ——— اچھی بچیاں ایسے موقعوں سے فائدہ

اٹھانے کی منتظر رہتی ہیں ـــــــ" اُس نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔

"مذاق چھوڑو" رفعت نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"میں طارق کے ابّا جان کے سامنے کیسے جا سکوں گی ـــــ"

"فکر نہ کرو ـــــــ ساجدہ بھی تو ساتھ آ رہی ہے۔ وہ خود تمہیں سنبھال لے گی۔"

"تم بھی میرے ساتھ اندر چلی چلنا ـــــــ"

"پاگل ہوئی ہو ـــــــ"

بات ابھی نرگس کے مُنہ ہی میں تھی کہ کوٹھی کے باہر موٹر کے ہارن کی آواز سُنائی دی اور دونوں لڑکیاں چونک پڑیں، اُنھوں نے کھڑکیوں کے پردے سرکا کر دیکھا۔

ساجدہ اور قدیر صاحب کار سے اُتر رہے تھے اور رفعت کی امّی اور ابّا جان ان کا استقبال کر رہے تھے۔

"لو اب تو قرار آ گیا ـــــــ" نرگس نے اس کے چٹکی بھری۔

"قرار سا قرار ـــــــ" رفعت نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن نرگس میری آنکھوں کو ابھی تک اعتبار نہیں آیا"

"بجیا ـــــــ" نرگس نے اُسے بھینچ لیا۔ وہ اپنی بہن کے جذبات سے آگاہ تھی۔

"آؤ اب مہمانوں کیلئے چائے وغیرہ تیار کر کے بھجوائیں۔"

"اوہ ہاں ـــــ یہ تو میں بھول ہی گئی ـــــ" رفعت نے سنبھلتے ہوئے

کہا اور باورچی خانے کی طرف ہولی۔

چیزیں پہلے ہی سے تیار تھیں ——— ملازم اُنھیں لے کر ڈرائنگ رُوم میں چلا گیا۔

اتنے میں ساجدہ ساڑی کا پیکٹ لئے ہُوئے اندر چلی آئی۔ اور آتے ہی رفعت سے لپٹ گئی۔

"کہو بھابی کیسے حال ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہیں تم اپنی کہو"

اس کے بعد ساجدہ نے نرگس سے ہاتھ ملایا اور اس کی خیریت پوچھی۔

"اچھا بھابی آپ جھٹ پٹ یہ ساڑی باندھ لیں ———" اُس نے نرگس سے فارغ ہو کر کہا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے ———" نرگس نے کہا۔

"میں یہ چاہتی ہُوں کہ بھابی یہ ساڑی پہن کر ابّا جان کے سامنے آئیں" ساجدہ نے اصرار کیا۔

"توبہ ——— اُبھی سے بھابی کا کتنا خیال ہے۔" نرگس نے ٹکڑا لگایا۔

"کیوں نہ ہو بھئی" ساجدہ نے مسکراتے ہُوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے بابا ——— میں ہاری۔ اس وقت تم دو ہو اور میں اکیلی ——— کیسے مقابلہ کر سکوں گی" نرگس کی اس بات پر رفعت

اور ساجدہ دونوں ہنس پڑیں۔

اِدھر ڈرائنگ روم میں قدیر صاحب اور رفعت کی امّی ابّا بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔

" بھائی صاحب! قدیر صاحب نے رفعت کے والد کو مخاطب کیا ہم اس شہر میں کئی پشتوں سے رہ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ ہمیں جانتے ہیں، میرا خیال ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کی شرافت و نجابت کے سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آپ دوسروں سے ہی اس کے متعلق معلوم کر سکتے ہیں۔"

" قدیر صاحب — " رفعت کے والد سنبھل کر بولے " آپ سے کون واقف نہیں۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ کے ایسے باعزّت گھرانے میں ہماری بیٹی بہو بن کر جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں میرے گھر سے زیادہ خوش رہے گی۔"

" یہ میری عزت افزائی ہے " قدیر صاحب نے ممنونیت سے کہا۔

" میں آپ کا یہ احسان تا عمر یاد رکھوں گا "

" آپ کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہیں —" رفعت کے ابّا بولے

" طارق کا تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے —— " رفعت کی امّی نے دریافت کیا۔

" بہن جی —— میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرا خیال ہے

کہ سارا کاروبار اب اس کے سپرد کردوں۔ "

اِدھر لڑکیوں کے کمرے میں عجیب کھسر پھسر ہو رہی تھی۔

" ہائے اللہ —— بھابی آپ تو بیحد پیاری لگ رہی ہیں۔"

" یہ سب ہمارا کمال ہے —— ان ہاتھوں کا " نرگس فخریہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

رفعت اور ساجدہ ہنس پڑیں۔

" اچھا بھابی اب باہر چلیں —— ابّا جان باہر منتظر ہیں"

" مجھے شرم آتی ہے ——"

" ابّا جان کو اِدھر لے آؤں "

" یہ ٹھیک ہے ——" نرگس نے چوٹ کی۔

رفعت نے جل کر اُس کی طرف دیکھا۔ اور ساجدہ کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔

" میرے طعنوں نے اتنا کام تو کیا " نرگس نے پیچھے سے کہا۔

" چُپ رہو چڑیل ——" رفعت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت پھر جواب دے گئی اور اور اس کے قدم رُک گئے۔

" چلیئے نا جناب "

" اب تو اُنھیں کھینچ کر لے جانا ہوگا " نرگس نے قریب آکر کہا۔

"کیوں"

"اب چلا کہاں جائے گا"

لڑکیوں کی یہ کھسر پھسر اب ڈرائنگ روم میں بھی سُنائی دینے لگی تھی۔ رفعت کی امّی اُٹھیں اور دروازے کے پاس آکر اُنھوں نے رفعت کو ایک بازو سے تھام لیا۔ دُوسرے بازو سے ساجدہ نے پکڑ لیا اور وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہُوئے دروازے سے باہر لائے۔ سامنے آکر رفعت سنبھل گئی۔

"السلام وعلیکم" رفعت نے مری مری آواز میں قدیر صاحب کو سلام کیا۔ ساجدہ اور رفعت کی امّی نے اُسے قدیر صاحب کے سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔

قدیر صاحب نے ایک نظر رفعت کیطرف دیکھا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے دُعا دی اور جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اسکے ہاتھ پر رکھ دی۔ رفعت بُت بنی بیٹھی تھی اس کیلئے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

"لے لو نا —— بھابی جان —— بڑا اچھا موقع ہے" ساجدہ نے ہنستے ہُوئے کہا اور اپنے ہاتھوں سے اُس کی مٹھی بند کر دی۔

"کیا ابا جان —— دیکھی آپ نے ہماری بھابی"

"ہاں بھئی —— ہماری بیٹی تو تمہاری تعریفوں سے بھی بڑھ کر حسین وجمیل ہے"

"اچھا آئیے بھابی اب ہم دُوسرے کمرے میں چلیں ——" ساجدہ نے

اُٹھتے ہوئے کہا۔ رفعت نے اُٹھ کر دوبارہ سلام کیا۔ قدیر صاحب نے اُسے دُعا دی اور وہ دونوں واپس چلی آئیں۔ بزرگ آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئے۔

"کتنے روپے لائی ہو ......" نرگس نے ہنستے ہوئے رفعت کو چھیڑا۔

"کیا پتہ میں نے گنے تھوڑی ہیں ......" رفعت نے نوٹوں کی گڈی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

نرگس نے گن کر کہا ......"اکیس سو"

ساجدہ نے مسکرا کر نرگس کو دیکھا اور رفعت کو چھیڑا۔

"بھئی ...... اب یہ بڑی امیر کبیر ہو گئی ہیں۔ ذرا ادب سے بات کرو"

" رفعت کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ اس وقت وہ خوشیوں کے ساتویں آسمان پر تھی۔

"اچھا بھابی اب اجازت دیں تاکہ بھائی جان کو بھی یہ خوشخبری پہنچا دیں بیچارے بیقرار ہو رہے ہوں گے"

رفعت نے جواب کچھ نہ دیا۔ وہ خود بھی اس خوشخبری کے جلد از جلد اپنے محبوب تک پہنچنے کی متمنی تھی۔ اس نے کوئی تعرض نہ کیا، ساجدہ دونوں بہنوں سے گلے مل کر ڈرائنگ روم میں آگئی جہاں قدیر صاحب اجازت لے رہے تھے۔

"کسی وقت آپ بھی غریب خانے پر تشریف لائیں ---" اُنھوں نے اُٹھتے ہوئے رفعت کے ابا سے کہا۔

"ضرور جناب ضرور میں یقیناً حاضرِ خدمت ہونگا"۔

کار میں بیٹھتے وقت اُنھوں نے پرجوش انداز میں ہاتھ ہلائے، رفعت کی امی نے نہایت شفقت سے ساجدہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دونوں میاں بیوی اُس وقت تک کوٹھی کے دروازے میں کھڑے رہے جب تک کار نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

باب ۱

قدیر صاحب اور ساجدہ جب گھر پہنچے تو طارق اُنھیں شدّت سے اپنا منتظر ملا۔ وہ ڈرائنگ روم میں قالین پر ٹہل رہا تھا۔

"بھیّا ـــــ مُبارک ہو ـــــ" ساجدہ دوڑی دوڑی اُس کی طرف گئی اور اُس سے لپٹ گئی۔

"مبارک ہو بیٹے ـــــ" قدیر صاحب نے بھی اُس کے گال تھپتھپاتے ہُوئے کہا۔

"بھیّا وہ سب تو بڑے اچھے لوگ ہیں ـــــ"

"ہم رشتے کی بات پکّی کر کے منگنی کی انگوٹھی پہنا آئے ہیں" قدیر صاحب نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ صفیہ ڈرائنگ روم کے ساتھ کھڑی اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ وہ دوڑی دوڑی ماں کے کمرے کی طرف گئی تاکہ ان کو بھی یہ تازہ ترین خبر سُنا سکے۔ بیگم صاحبہ یہ خبر سُن کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں اور پٹ سے بیہوش ہوگئیں۔

چلّا چلّا کر صفیہ نے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔

سب لوگ دوڑے دوڑے اِدھر گئے اپنی بیگم کو بیہوش دیکھ کر قدیر صاحب گھبرا گئے، وہ ڈاکٹر کو فون کرنے کیلئے فوراً ٹیلیفون والے کمرے کی طرف لپکے۔ طارق ان کے تلوے سہلانے لگا، ساجدہ اور صفیہ اُن کے جسم کو دبانے لگی چند منٹ بعد ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی بیگم صاحبہ ہوش میں آگئیں، اپنے اردگرد سب گھر والوں کو دیکھ کر وہ حیران سی لگ رہی تھیں۔ پھر جیسے اُنھیں سب کچھ یاد آگیا۔ اُنھوں نے اپنا سر دباتے ہوئے ساجدہ کے ہاتھ پرے جھٹک دئے۔

"نکل جاؤ اس کمرے سے ـــــــ" اُنھوں نے نفرت سے طارق کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی اندر آگیا۔

"یہ بیہوش ہوگئی تھیں۔ انھیں دیکھ لیجئے ـــ" قدیر صاحب نے ڈاکٹر سے کہا، ڈاکٹر آگے بڑھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہُوں ڈاکٹر" بیگم صاحبہ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہُوئے کہا اور مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"بیگم یہ کیا کر رہی ہو ـــ؟" قدیر صاحب نے حیرت سے کہا۔ ڈاکٹر بیچارہ ششدر کھڑا تھا۔ وہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ اور اُس نے کبھی میاں بیوی میں بیگانگی محسوس نہیں کی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب آپ تشریف رکھیں ـــــــ" طارق نے کرسی آگے سرکاتے ہُوئے کہا۔

" جی ہاں آئے ہیں تو مرضیہ کو دیکھ کر ہی جائیں گے ان کا معائنہ کرانے سے انکار بھی میرے خیال میں ایک بیماری ہے ——" قدیر صاحب بولے ڈاکٹر چپ رہا۔

" ڈاکٹر صاحب آپ وقت ضائع نہ کریں —— میں ——" بیگم صاحبہ اتنا کہہ کر پھر بے ہوش ہو گئیں، ڈاکٹر نے معائنے کے بعد ایک انجکشن لگایا اور نسخہ لکھ کر دے دیا۔

" فکر کی کوئی بات نہیں ہے —— ذرا نقاہت ہو رہی ہے —— یہ ابھی ہوش میں آجائیں گی۔"

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد وہ ہوش میں آگئیں۔

" دنیا میں کوئی ایسی ماں بھی ہو گی جو اپنے جوان اور اکلوتے بیٹے کی خوشی برداشت نہ کر سکے ——؟ بیسویں صدی نے ماؤں کے خون سفید کر دئے ہیں۔ قدیر صاحب بجائے فکرمندی کے غصے میں بھرے ہوئے تھے، ان کو اپنی بیگم کا اس موقع پر رویہ قطعاً اچھا نہیں لگا تھا۔

" ابا جان آپ اپنے کمرے میں چلیں" ساجدہ نے کہا۔

" میرے جاتے ہی تم اور طارق بھی نکال دئے جاؤ گے۔"

" ابا جان یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

" اسے یہ خبر کس نے پہنچائی ہے۔ ——؟" انھوں نے طارق کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

" میں نے ——" حفیظ نے اعتراف کیا۔

"تم شائد اپنی ماں کو زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتیں"۔

صفیہ خاموش رہی۔

"جواب تو دو ——" قدیر صاحب نے ڈانٹا۔

"مجھے کیا پتہ تھا کہ امی ——" وہ سِسکنے لگی۔

"صفیہ۔ تم اب ننھی سی بچی نہیں ہو —— لگائی بجھائی کی عادت ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا ——"

وہ بُت بنی بیٹھی رہی۔

"کیوں اس کے پیچھے پڑے ہو —— اس نے کیا کیا ہے" بیگم صاحبہ نے تلخی سے کہا۔

"اُس نے کیا قصور کیا ہے ——"

"تمہیں مارنے کی کوشش کی ہے۔"

"اور آپ جو کچھ کرتے پھر رہے ہیں وہ کیا ہے ——" بیگم صاحبہ نے تلخی سے کہا۔ قدیر صاحب اب تک اپنے آپ پر بڑا قابو رکھ رہے تھے۔ بیگم کی یہ بات سُن کر وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

"کان کھول کر سُن لو —— اگر تم نے اپنی مرضی دوسروں پر ٹھونسنے کی عادت جاری رکھی تو سخت نقصان اٹھاؤ گی۔ آج کے بعد میں دوبارہ تمہاری ضد کو برداشت نہیں کروں گا"، وہ جھلّائے ہُوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ساجدہ اور طارق نے بھی ماں کے تیور دیکھ کر باہر چلے جانے میں

ہی خیریت سمجھی۔

بیگم قدیر غصّے سے لال پیلی ہو رہی تھیں اور صفیہ اُن کے پائینتی بیٹھی تھی اتنے میں نوکر دوائیں لے کر اندر داخل ہُوا۔

"باہر پھینک دو ان کو ـــــــ" بیگم صاحبہ نے تقریباً چیختے ہوئے نوکر کو ڈانٹ پلائی۔

"مجھے نہیں چاہئیں دوائیں ـــــــ"

"نہ امّی جان ـــــــ" صفیہ نے انھیں منع کرنا چاہا۔

"دفع ہو جاؤ تم بھی ـــــــ" اُنھوں نے سختی سے کہا۔ صفیہ چُپ چاپ کمرے سے نکل آئی۔

شادی کا دن طے کرنے کا معاملہ ابھی آگے نہیں بڑھا تھا طارق کے والد کی مصروفیات ہی اس میں مانع تھیں ورنہ دیر کی کوئی بات نہ تھی۔ اسی دوران ایکدن طارق اور رفعت کی ملاقات ہُوئی رفعت کا شباب پہلے سے نکھرا ہُوا تھا۔ اور حُسن و جمال میں نئی کشش پیدا ہو گئی تھی آنکھوں کی زیادہ چمک اور گال کی سُرخی گہری ہو گئی تھی، طارق اسے دیکھ کر جھوم گیا۔

"آج سرکار پہچاننے میں ہی نہیں آ رہی ----"

"کیوں ـــــــ" رفعت نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ سوال آئینہ دیکھ کر کیا ہوتا۔ کیا تمہیں اپنے آپ میں کوئی تبدیلی

نظر نہیں آتی ——"

"طارق ——" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"میں آج کل اتنی خوش ہوں —— اتنی خوش کہ بتا نہیں سکتی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں پرندوں کی طرح ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں، رات میں اپنے گھر کی چھت پر کھڑی ہو کر دیر تک نیلے آسمان کو دیکھتی رہی، چاند کا سُنہری بجرہ نیلے سمندر میں تیر رہا تھا، ہر طرف تاروں کے پھول جھلملا رہے تھے، میں نے بے اختیار ہو کر اپنا ایک بازو اُٹھا دیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ آکاش کو چھو رہا ہے۔ آسمان کی نیلاہٹ میرے ہاتھ پر بکھر رہی ہو گئی تھی، پھر میں نے چاند کے سُنہری ماتھے کو اپنے ہاتھ سے چھوا اس کے بعد ستاروں کو سہلاتی رہی۔ ان کی نوکیں اپنے ہاتھ پر رکھیں۔ میں دیر تک اس کھیل سے محظوظ ہوتی رہی۔ پھر یکایک میرا قد بڑھنے لگا۔ اور میرا سر آسمان کی چھت سے ٹکرا گیا —— چاند میرے چہرے کے مقابل آ گیا اور ستاروں کے جھرمٹ میرے گلے سے لپٹ گئے۔ چاندنی جیسے میرے مساموں کے راستے میرے سارے جسم میں اُترنے لگی۔ میری آنکھیں ستارے کی سفید روشنی سے بھر گئیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چاند کا طشت اٹھا لیا۔ وہ میرے ہاتھوں میں تھا اور میں آسمان پر تھی۔ میں نے چاند کو اپنے ہونٹوں سے چھُوا —— اس کی خنکی میرے جلتے ہُوئے ہونٹوں کو ٹھنڈک پہنچانے لگی۔ میری آنکھیں مندنے لگیں —— پھر چاند میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اور میں اپنے گھر کی چھت پر گر پڑی۔ میرا چہرہ آسمان کی طرف تھا

اور وہیں پڑے پڑے میں سو گئی۔ پھر ساری رات تم میری باہنوں میں رہے اور میں تمہارے بال سنوارتی رہی اور تم ـــــ تم میرے اپنے ـــــ" اور صوفے پر بیٹھی بیٹھی اُس کے بازؤں میں جھول گئی۔

طارق نے اُس کو تھام لیا۔ آہستہ آہستہ اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اُسے یاد آیا کہ وہ ہوٹل کے کمرے میں طارق کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے رفعت ـــــ تم کن دُنیاوں کی سیر کر رہی ہو" طارق نے اس کے گرد اپنے بازؤں کی گرفت مضبوط کرتے ہُوئے پیار سے پوچھا۔

"پتا نہیں ـــــ" اُس کا چہرہ ہلکا سا زردی مائل ہو رہا تھا

"ابھی تم گرنے لگی تھیں۔"

"طارق تم تھامنے والے ہو تو میں ہزار بار گروں گی" وہ جیسے نشے کے عالم میں گفتگو کر رہی ہو۔

"رفعت ـــــ میری رفعت ـــــ" طارق نے محبّت سے بھرپور لہجے میں اُسے پکارا۔

"طارق ـــــ میرے طارق"

"طارق نے اُسے مضبوطی سے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اپنے پیاسے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ یہ اس کی محبّت کا اقرار تھا۔ پیار کرنیوالوں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب بولنے کو جی

نہیں چاہتا بلکہ اپنے جذبات کا اظہار اشاروں کنایوں سے ہی دیا جاتا ہے۔ طارق کی مضبوط گرفت اور بوسے کا مفہوم رفعت مکمل طور پر سمجھ گئی تھی۔ دیر تک وہ ایک دُوسرے میں کھوئے ہُوئے بیٹھے رہے۔ پھر اگلے دن ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔

باب ۱۱

بات نہایت معمولی سی تھی۔ اگر طارق اتفاقاً بیگم صاحبہ کو ایک لڑکی کے ہمراہ دکھائی نہ دے جاتا تو یہ جھگڑا کبھی کھڑا نہ ہوتا۔ بیگم صاحبہ خود اپنے بیٹے سے بہت محبّت کرتی تھیں لیکن اس وقت اُن کی پسند و ناپسند نے عزّت اور وقار کے مسئلے کا رُوپ دھار لیا تھا۔ دل میں وہ بھی اپنی زیادتی کو محسوس کرتی تھیں لیکن اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ وہ اتنا کچھ کہہ سُن چکی تھیں کہ اب اس سے گریز خود اپنے آپ کو گھر کے دوسرے افراد کی نظروں سے گرانے کے مترادف تھا۔ اور یہی بات اب اُن کیلئے تلخی کا موجب بنی ہوئی تھی پھر قدیر صاحب کی لاپرواہی اور طارق کی منگنی کرنے کے واقعے نے اُنھیں سر سے لے کر پاؤں تک جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔ اُنھیں قطعاً اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ اس قسم کا کوئی کام اُن کی مرضی کے بغیر بلکہ ان کے بغیر سوچا بھی جا سکتا ہے، لیکن حقیقت بالکل اُلٹ صورت میں اُن کے سامنے تھی اور وہ کسی صورت میں اُن سے آنکھیں نہیں بچا سکتی تھی، طارق کی منگنی کر دی گئی تھی۔ اور اُنھیں پوچھا بھی

نہیں گیا تھا۔ حتیٰ کہ شادی کی تاریخ کے سلسلے میں بھی بات چیت چل رہی تھی یہ سلسلہ یقیناً اپنی انتہا کو پہنچتا تھا کیونکہ اُنھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ قدیر صاحب جو بات ایک بار اپنے مُنہ سے نکال دیتے ہیں اُس سے پیچھے ہٹنا ناممکن سی بات ہوتی ہے۔ اُنھوں نے کبھی زندگی میں اپنے خاوند کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا تھا اگرچہ اُن کے خاوند خود ہی کوئی کام اُن کی مرضی و منشا کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں نے روائت کے خلاف قدم اُٹھایا۔ اس میں پہل بیگم صاحبہ کی طرف سے ہُوئی تھی۔ قدیر صاحب نے اصُول پرستی کی وجہ سے ان کی خواہش کے بالکل اُلٹ اپنے بیٹے کی حمایت کی تھی، اب یہ حمایت سانپ کے مُنہ میں چھچھوندر بن گئی تھی جسے نہ ہی نگلا جا سکتا تھا اور نہ ہی اُگلا جا سکتا تھا۔ اب ساری صورتِ حال ایک نیا رُخ اختیار کر رہی تھی جس کے کچھ پہلو بیحد عجیب تھے۔

صفیہ اور بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں یوں بیٹھی ہُوئی تھیں جیسے ابھی ابھی کسی عزیز کو دفن کر کے آئی ہوں، اُن کے چہرے اُترے ہُوئے تھے اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے آج کا دِن ان کا یومِ شکست تھا۔ اُن کی خواہشوں اور تمناؤں کے پھُول کھِلنے سے پہلے ہی مُرجھا گئے تھے۔ خورشید کی صورت میں اُمید کی جو کرن اُنھیں دکھائی دی تھی وہ دم بھر کیلئے چمک کر ظلمات کے سینے میں اُتر کر گُم ہوگئی تھی، حسرت و یاس کے سوا اب اُن کی غمخواری کرنے والا بھی کوئی نہ رہا تھا۔

"امّی ——— اب کیا ہو گا" صفیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب کیا ہونا ہے ——— جو ہونا تھا ہو بھی چکا ———" بیگم صاحبہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اگر ابّا جان کو عقل ہوتی تو ہرگز یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

"خدا جانے اُنھیں کیا ہو گیا ہے ———"

"یہ سب ساجدہ کی کارگزاری ہے ———" صفیہ نے اُنھیں سمجھایا۔

"وہی اُن کے کان بھرتی رہی ہے۔ بڑی آئی بھیّا کی حمایت کرنے والی ——— امّی جان ——— اسے تو آپ کی رتّی بھر پرواہ بھی نہیں ہے ———"

"بس دیکھتی جاؤ ———" وہ نفرت سے بولیں۔

"کتنا بڑا دن اور کتنی بڑی رات۔ اس چاندنی کا انجام اندھیرا ہی ہو گا" اُنھوں نے فیصلہ سنایا۔

"امّی ——— ہمیں یُوں خاموش ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے" صفیہ نے شوشہ چھوڑا۔ وہ شکست انا کی وجہ سے شر پسندی میں اپنی حدود سے بہت آگے نکل گئی تھی۔

"تو اور کیا کریں ———"

"خورشید کو اس بات کی اطلاع ضرور دینی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے وہی

کچھ کر سکے ـــــــ" صفیہ نے تجویز پیش کی۔

"میں تمہیں اس بات کا مشورہ ہرگز نہیں دے سکتی ـــ"

"وہ کیوں ـــــ امّی جان"

"بس میری مرضی"

"آپ بھی خوب ہیں" اس نے انھیں اُبھارنا چاہا۔

"اپنی دُنیا اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتی دیکھ رہی ہیں لیکن پھر بھی خاموشی اختیار کئے ہُوئے ہیں ـــ"

"مجھے معلوم ہے کہ اب خورشید بھی اس معاملے میں کچھ نہ کر سکے گی ـــ"

"امّی جان آپ اُس کی ذہانت سے واقف نہیں۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکال لے گی جس سے ساجدہ اور بھیّا کے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔"

اگر وہ خود یہاں آجائے تو پھر اس معاملے میں گفت گو کرنا اور بات ہے لیکن تمہارا اُس کے گھر جا کر اس سلسلے میں کچھ کہنا قطعاً دانشمندی کا مفہوم نہیں رکھتا ـــــ" بیگم صاحبہ نے اُسے سمجھایا۔

"اور اگر تمہارے ابّا جان کو اس بات کی خبر ہو گئی تو بس قیامت ہی آجائے گی۔ پھر اس گھر کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی ـــ"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ ابّا جان کا روّیہ ویسے ہی سخت ناگوار ہے

اور کیا پتا وہ کس وقت کیا کر دیں ــــ" صفیہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے پھر بھی وہ اپنی بساط بھر والدہ کو ساجدہ اور طارق کے خلاف کچھ نہ کچھ کر گزرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اُس کو سب سے زیادہ ناراضگی ساجدہ ہی سے تھی کیونکہ اُس نے چھوٹی ہونے کے باوجود بھائی کے دل پر قبضہ کر رکھا تھا اور اس کی عین مرضی کے مطابق عمل کر رہی تھی، یہ ایک فطری بات ہے کہ برابری میں بہنیں کم از کم اپنے بھائی کے معاملے میں ضرور ایک دوسرے کی رقیب ہوتی ہیں۔

ساجدہ نے اس معاملے محبّت ہمدردی اور رفاقت کے ذریعے بھائی کا دل موہ لیا تھا جب کہ صفیہ نے یہ مقصد اپنے بڑے پن اور رعب کے اظہار کے ذریعے حاصل کرنا چاہا تھا جس میں اُسے سخت ناکامی ہُوئی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ساجدہ کے دل میں اپنی بہن کیلئے کسی قسم کی رنجش نہیں تھی۔ وہ صاف دلی اور خلوص کے ساتھ بھائی کی چہیتی تھی اس بات پر اُسے فخر تھا اور یہی بات صفیہ کو ہر وقت پیچ و تاب میں مبتلا رکھتی تھی۔

اُن کی گفت گو کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی اور وہ باتیں کرتی کرتی سو گئیں۔

خورشید کو آج طارق رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی دن اسے ان کے گھر کی طرف نہیں گئی تھی، دراصل وہ سالگرہ والے دن کا ردِ عمل دیکھنا

چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید طارق دوبارہ کسی بہانے اس کے ہاں آئے گا، لیکن پچھلے کئی دونوں کے انتظار کا نتیجہ سوائے مایوسی اور بددلی کے اور کچھ نہیں تھا، صفیہ بھی نہیں آئی تھی جس سے حالات کی خبر ہی مل جاتی اس لئے اُس نے فیصلہ کیا وہ خود جا کر اُن سے ملے گی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا جس میں طارق کے گھر پر ہونے کے امکانات بھی کافی تھے۔ اس طرح، دیدارِ یار کا موقع بھی میسّر آسکتا ہے، دھڑکتے دل کے ساتھ اُس نے کار کو قدیر لاج کے دروازے اندر موڑا، برآمدے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، اُس نے خاموشی سے گاڑی کھڑی کی اور اندر آگئی، طارق کا کمرہ خالی پڑا تھا اور ساجدہ اپنے کمرے میں بستر پر سو رہی تھی، خورشید کے دل میں کئی اندیشوں نے سر اُبھارا اور وہ سنبھل سنبھل کر پاؤں دھرتی صفیہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ماں بیٹی صوفے پر ایک دُوسری کے پاس پاس بیٹھی تھیں۔

"خورشید ——" صفیہ نے اُسے دیکھ کر تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا اور لپک کر اُس سے لپٹ گئی، بیگم صاحبہ کا چہرہ بھی دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے —— آپ لوگ اس قدر غمزدہ کیوں ہیں" اُس نے تعجب سے اُن کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا اور صفیہ کو صوفے پر بٹھا دیا اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

صفیہ نے ساری رام کہانی ہچکیوں میں اُسے کہہ سُنائی۔

خورشید پر جیسے بجلی گری۔ طارق کی منگنی کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی پھر طارق کے والد صاحب کی واپسی اور اُن کا رویّہ اس کیلئے سخت اچنبھے کا باعث تھا۔ پانی سر سے گذرا جا رہا تھا اُس کا رنگ مایوسی اور صدمے کی وجہ سے پیلا پڑ گیا۔

"ہائے بیچاری ——" طارق کی امّی نے کہا۔ خورشید کی زرد ہوئی رنگت دیکھ کر وہ اپنا دُکھ بھول گئی تھیں۔

"لیکن آپ کچھ نہ کریں ——" خورشید نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں کیا کر سکتی تھی۔ پہلے بیٹے نے بغاوت کی تھی پھر اس کے ساتھ بیٹی بھی شامل ہو گئی اور اب خاوند نے بھی مُنہ پھیر لیا ہے۔" بیگم روائتی عورتوں کی طرح سِسکنے لگیں۔ آخر عورت تھیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے ہار مان لی ہے ——" خورشید نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"اور کر بھی کیا سکتی ہوں ——"

"مجھے تو ان لوگوں پر تعجّب ہوتا ہے جنھوں نے ماں کی موجودگی کے بغیر منگنی کی رسم ادا کر دی۔ نہ جانے کیسی ذہنیّت کے لوگ ہیں۔"

"کمینے ہیں ——"

"صفیہ تمہیں اُس لڑکی کے گھر کا علم ہے۔ ——" خورشید نے کھوج لگانے والے انداز میں پوچھا۔ شائد اس کے ذہن میں کوئی،

منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں ——" صفیہ نے متنفر آمیز لہجے میں کہا۔

"ساجدہ ہی بھیّا کی راز دار ہے اُسی کو کچھ معلوم ہو تو ہو وہ لوگ کہاں رہتے ہیں —— کون ہیں —— ساجدہ تو کل اُن کے گھر سے بھی ہو کر آئی ہے ——"

"ارے ہاں وہ کِدھر ہے نظر ہی نہیں آئی" خورشید نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں تو وہ پاؤں بھی نہیں رکھ سکتی۔" صفیہ نے حقارت سے کہا۔

"آؤ ذرا اُس کے کمرے تک چلیں ——"

"تم ہی جاؤ میں تو اس سے کلام بھی نہیں کرتی"

"ابھی تک لڑائی جا رہی ہے ——؟"

"اور نہیں تو کیا ——"

"بھئی بہنوں بہنوں کو اس طرح دُور دُور نہیں رہنا چاہئیے"

"کہاں کی بہن —— کس کی بہن —— جب ماں کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ میری کیا رہی ——؟"

"آؤ میں تم دونوں کی صلح کرا دوں"

"نہیں ——"

"اتنی بُری بھی نہیں ہے ——"

"تم جانو ——"

"مجھے اس پر اعتماد ہے ——"

"ہوگا ——"

"کیوں امّی جان —— اجازت ہے اس سے ملنے کی" اُس نے چال چلی۔

"ہاں ہاں —— کیوں نہیں۔ تمہاری سہیلی ہے تو سو بار ملو"

خورشید ساجدہ کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ ابھی ابھی جاگی تھی اور آنکھیں مل رہی تھی۔

"جوانی کی نیند ہے نا ——" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہُوئے کہا۔

ساجدہ کی تیوری پر بل پڑ گئے لیکن اس نے فوراً اپنا روّیہ بدل کر چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ طاری کر لی۔

"اُس دن بھائی جان تمہارے ناچ کی بڑی تعریف کر رہے تھے ——" اُس نے خورشید کو جلانے کیلئے کہا۔

"لو اور سُنو —— ہمارے ناچ کی کون تعریف کرتا ہے ——" خورشید بھی ایک کائیاں تھی۔

بھائی جان کرتے ہیں —— ہم تو نہیں کرتے، ویسے اُن

کی رائے پر مجھے بھی کوئی بھروسہ نہیں ——— بعض اوقات جھوٹی تعریفیں بھی کر جاتے ہیں ———" وہ اُسے زیادہ سے زیادہ ستانے اور جلانے پر تل ہی گئی تھی۔

" یہ سچ کہا ہے ——— آخر سچی بات زبان پر آ ہی گئی نا "

خورشید نے پھر کسی قسم کا ملال ظاہر نہ ہونے دیا۔

" سچ جھوٹ کو چھوڑو ——— کہو اِدھر کیسے آئی ہو اور اُدھر کیا کیا باتیں ہُوئی ہیں ——— کب کی آئی ہو ———"

" ابھی آئی ہُوں۔ اُدھر سے دُعا سلام کرنے کے بعد ادھر آ گئی ہُوں۔ اور آئی صرف تم سے مِلنے کے لئے ہُوں۔ جی چاہا آ گئی، کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے ———"

" سو بار آؤ۔ ——— ہزار بار آؤ، بار بار آؤ ———"

" شکریہ ——— !"

" شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہئیے کہ کبھی کبھی یہ پیاری پیاری صورت دکھا جاتی ہو ——— ہائے تم کتنی خوبصورت ہو ———" ساجدہ نے ایک انتہائی طنزیہ انداز میں فقرہ کہا اور خورشید پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

" میری پیاری نہ شرماؤ ——— مکھڑے سے گھونگٹ کو اٹھاؤ" ساجدہ نے ایک اور تُند حملہ کیا۔

" آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ———" خورشید کے لہجے میں اب تحیّر شامل ہو گئی تھی۔

"تم سامنے آجاؤ تو دل بس میں نہیں رہتا۔ بے اختیار ہو جاتی ہوں ——"

"کسی ڈراما میں حصّہ لے رہی ہو —— سمجھ گئی ہوں —— کب ہو رہا ہے یہ ڈرامہ ——"

"ڈراما —— ڈراما —— ڈراما —— تم آجاؤ تو زندگی خود، ایک ڈراما بن جاتی ہے۔ تم اس ڈرامے کی جان بن جاتی ہو" ساجدہ نے اداکاروں کی طرح مکالمہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی اب کوئی کام کی بات کرو ——" خورشید ساجدہ کی طنز کا مفہوم سمجھ گئی تھی لیکن اتنی جلدی ہار ماننے والی نہ تھی۔

"تمہارے خیال میں کیا عشق و محبّت کی باتیں کام کی باتیں نہیں ہوتیں۔؟"

"اس وقت ہوتی ہیں جب چاہنے والی ایک لڑکی ہو اور دُوسرا لڑکا"

"کیا دو لڑکیاں ایک دوسری پر عاشق نہیں ہوتیں ——"

"نہیں ——"

"ہائے —— تم میری محبّت کو کیا سمجھتی ہو۔ لیکن میں تو تم پر مرتی ہوں جان فدا کرتی ہوں —— دم بھر کے لئے میرے قریب آجاؤ تاکہ میرے بے چین دل کو قرار آجائے ——" ساجدہ اس کو ایسی باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتی تھی، وہ جانتی تھی کہ جونہی

خورشید کو موقع ملا وہ اپنی کاٹ دار باتوں سے اُسے بھڑکانے کی کوشش کرے گی۔

"میں چلتی ہُوں ———" خورشید جانے لگی۔

"میں روکتی ہُوں ———" ساجدہ بولی۔

خورشید نے مُڑ کر دیکھا۔ ساجدہ کے چہرے پر سنجیدگی ہلکی سی تھی۔

"تم رفعت سے ملیں یا نہیں ———؟" خورشید نے فوراً ہی پہلو بدل کر مطلب کی بات کی۔

"نہ ملی اور نہ بھیا ملواتے ہیں۔"

"کیوں ———"

"کہتے ہیں شادی کے بعد ہر وقت ملتی رہنا۔ وہ تمہارے ہی پاس رہے گی۔"

"گویا تم اس شادی پر راضی ہو گئی ہو ———"

"میں کون ہُوں راضی نہ ہونیوالی۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی شادی کسی کی ——— کسی کے ساتھ ——— ہمیں کیا ——— ؟ خوش رہیں ——— یہ دُعا ہے"

"تم آج جھوٹ بول رہی ہو ——— ———" خورشید نے پہلو سے حملہ کیا۔

"کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے ———"

"کیا تم رفعت کے گھر جا نہیں چکیں ؟"

"تمہیں کس نے بتایا ہے ——؟"

"صفیہ نے ——"

"ابھی تو تم نے یہ کہا تھا کہ اُدھر بس دُعا سلام ہی ہُوئی — جھوٹی تم ہو یا میں ——؟" ساجدہ کے لہجے میں اب تلخی تھی۔

"دُعا سلام کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی بات ہی نہیں ہُوئی —"

"تم نے مجھ پر تو یہی ظاہر کرنا چاہا تھا کہ امی اور باجی سے تمہاری کوئی بات نہیں ہُوئی اور تم صرف مجھ سے ملنے آئی ہو ——"

"آج تو تم پیچھے ہی پڑی ہُوئی ہو ——"

"خورشید ——" ساجدہ نے اچانک حکمانہ لہجے میں کہنا شروع کیا میری بات غور سے سُنو —— میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی لیکن ایک بات تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہُوں —— ذرا خود ہی سوچو کہ پیچھے کون پڑا ہے —؟ میں یا تم —؟ جواب دو —! تمہارا کیا خیال ہے کہ اس گھر میں تمہاری آمد کا مقصد مجھے معلوم نہیں ہے؟"

میں سب کچھ جانتی ہُوں —— طارق بھائی کسی اور کے ہو چکے ہیں — تم ذرا دیر سے آئی ہو —— اپنے آپکو زیادہ پریشان نہ کرو ایک گاڑی نِکل جائے تو مسافر دُوسری گاڑی پکڑ لیتا ہے، نکل جانے والی گاڑی کے پیچھے دوڑ نہیں لگاتا، اگر تم گاڑی کے پیچھے دوڑ لگاؤ گی تو ٹھوکر کھا کر گر پڑو گی —— یا تھک کر گر و گی —— ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ وقار کے ساتھ اس حادثے کو برداشت کرو، یہی تمہارے شایانِ

نشان ہے ——"

خورشید سناٹے میں آگئی تھی، اسے وہم بھی نہیں تھا کہ ساجدہ اتنی زیرک اور دانشمند بھی ہوسکتی ہے۔ وہ اب اس سے رفعت کا پتا حاصل کرنا تو کجا کسی قسم کے ہمدردانہ سلوک کی توقع بھی نہیں رکھ سکتی۔ رنج اور مایوسی نے ایک دم کو اُس کو آلیا اور وہ بغیر کچھ کہے سُنے کمرے سے باہر آگئی۔ بیگم صاحبہ اور صفیہ سے ملے بغیر اُس نے گاڑی کا رُخ کیا اور تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی گھر کی طرف چل دی اُس کے جسم کا رواں رواں دُکھ اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ آج اس کی بے عزتی اور دل شکنی ساجدہ نے کی تھی۔ اُس نے اس کی آتشِ انتقام کو پوری طرح بھڑکا دیا تھا۔ اگر عام حالات میں اُسے کسی قسم کا شکست کا سامنا کرنا پڑتا یا وہ ایک عام گھریلو قسم کی لڑکی ہوتی اور جرائم کے حلقے سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تو وہ یقیناً رو دھو کر چپ بیٹھ جاتی —— لیکن وہ تو سراسر فریب —— جھوٹ اور جرائم میں ڈوبی ہوئی تھی اس کا بھائی ایک شریف غنڈہ تھا جو اس کی مدد سے بہتیری خلافِ قانون حرکات کا مرتکب ہوتا ہے، پھر وہ اس معاملے میں کس طرح خاموش رہ سکتی تھی وہ ہرگز خاموش نہیں رہ سکتی تھی، نفرت اور انتقام اس کے لہو میں سرائیت کر گئے تھے اور اب وہ شعلۂ جوالہ بنی اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہی تھی جہاں سے نجانے کس کے نشیمن پر بجلی بن کر گرنا تھا۔

باب ۱۲

"خورشید کا یوں خاموشی سے رخصت ہو جانا کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔" ساجدہ نے کچھ سوچتے ہوئے دل میں کہا۔ اب تو بات کھل کر اس کے سامنے آ گئی تھی یقینی طور پر اب خورشید یا تو بالکل چپ ہو جائیگی اور یا پھر کوئی نیا فریب دینے کی کوشش کرے گی، لیکن یہ نیا فریب کیا ہو سکتا ہے، ساجدہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور آخر تھک ہار کر اس نے اس موضوع کو ہی ذہن سے نکال دیا۔

دوسری طرف بیگم صاحبہ اور صفیہ پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ خورشید بغیر انھیں ملے چلی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ساجدہ سے اس کی جھڑپ ہو گئی ہے۔ اب وہ دو ہی باتیں سوچ سکتی تھیں ایک تو یہ کہ خورشید اس ڈرامے سے بالکل غائب ہو جائے گی اور وہ صورتِ حال پر قابو پانے کیلئے اکیلی رہ جائیں گی، یا پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ خورشید کوئی ایسا قدم اٹھاتی جو انھیں رفعت اور طارق کی شادی روکنے میں کامیابی سے ہمکنار کر دیتا۔

اس بات کی وضاحت کے سلسلے میں انتظار کی ضرورت تھی لیکن انتظار نقصان دہ بھی ہو سکتی تھا۔ ممکن ہے وہ انتظار کرتی ہی رہ جاتیں اور قدیر صاحب طارق کی شادی اپنے منصوبے کے تحت رفعت سے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں، یہ وقت اُن کے نقطۂ نظر سے کسی انقلابی فیصلے کا تھا چنانچہ اُنھوں نے کافی دیر کی سوچ وبچار کے بعد یہ فیصلہ کر ہی لیا، وہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کے پاس کراچی چلی جائیں گی اور صفیہ کو بھی ساتھ لے جائیں گی۔

اس فیصلے پر پہنچتے ہی انھوں نے صفیہ سے اس کا ذکر کیا اور فوری طور پر اسے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ متفقہ طور پر کر لیا گیا، صفیہ پروگرام کے مطابق شام کو خریداری کے بہانے شہر گئی اور اُس نے اپنے ماموں کو والدہ کی طرف سے ٹیلیگرام دے دیا کہ وہ اگلے دن کی شام کراچی ایکسپرس سے کراچی پہنچ رہی ہیں۔ اُس نے ریلوے اسٹیشن جا کر رات کی گاڑی سے درجہ اوّل میں دو زنانہ برتھ بھی ریزرو کرا دیئے اور فوری طور پر واپس چلی آئی۔ اس دوران بیگم صاحبہ نے ضرورت کی چیزیں دو اٹیچی کیسوں میں رکھ لی تھیں۔ گاڑی رات کے دس بجے روانہ ہوتی تھی اور ان کا پروگرام یہ تھا کہ وہ فلم دیکھنے کے بہانے ساڑھے آٹھ بجے نکلیں گی اور گاڑی پکڑ لیں گی، گھر والوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ضروری تھا اس سلسلے میں۔ آپس کے خاندانی جھگڑے ایک طرف تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنے خاوند کو قبل از وقت مطلع کر کے اپنے رویے کی شدت کو گھٹانا نہیں چاہتی تھیں لیکن اُن کو کسی نہ کسی صورت

آج ہی اس بات سے مطلع کرنا نہایت ضروری تھا، چنانچہ اُنھوں نے اس مضمون کا خط اپنے شوہر کے نام لکھا۔

" قدیر صاحب!

مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ انتہا پسندانہ اور یک طرفہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ میں سمجھتی ہُوں کہ طارق کی شادی کے معاملے میں آپ نے میری رائے کو ٹھکرا کر دراصل مجھے ٹھکرا دیا ہے، مجھے اس بات کی قطعاً توقع نہ تھی لیکن حقیقت جو کچھ تھی، سامنے آگئی ہے، اب آپ جانیں کہ آپ کو یہ قصّہ کس طرح نپٹانا ہے میں اپنے آپ کو اس سے بالکل الگ سمجھتی ہُوں، میں آج رات کی گاڑی سے کراچی اپنے بھائی کے پاس جارہی ہُوں۔ میری جلد واپسی کی توقع نہ رکھیں اس عرصے میں آپ جو کچھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، صفیہ کو میں اپنے ساتھ لے جارہی ہُوں کیونکہ اس بیچاری کو یہاں اجنبیوں بلکہ دشمنوں کے درمیان چھوڑنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ خدا آپکو خوش رکھے۔

فوزیہ

جسے آپ کبھی ملکہ کہا کرتے تھے

خط لکھ کر لفافے میں بند کرتے وقت اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بغیر شوہر کی رضامندی کے، جو اُن کا محبوب بھی تھا، کہیں باہر جارہی تھیں، لڑائی جھگڑے پہلے بھی بہت ہُوئے تھے، ایک دوسرے سے خفگی کا اظہار زندگی میں سینکڑوں بار کیا گیا تھا۔ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کیلئے بے شمار دفعہ خاوند سے رخصت ہُوئیں تھیں لیکن یہ پہلا موقع

تھا کہ وہ اپنی مرضی اور شوہر کی خفگی کے عالم میں جا رہی تھیں اور ایسے حالات میں جبکہ شوہر کو خبر بھی نہ ہوگی اور وہ ریل میں سفر پر روانہ ہو چکی ہوں گی۔
ایک لمحے کے لئے اُن کا جی بھر آیا اور چاہا کہ خط کو پھاڑ کر پھینک دیں اور جا کر اپنے خاوند کے قدموں پر گر پڑیں لیکن پھر اُن کی نسائیت اور انا نے ان کے پاؤں جکڑ لئے، وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکیں۔ لفافے کو اُنھوں نے میز پر رکھ کر اس پر قدیر صاحب کا نام لکھ دیا اور صوفے پر بیٹھ کر خیالوں میں ڈوب گئیں۔

صفیہ بھی جانے سے پہلے خورشید کو اپنے اس اقدام سے مطلع کرنا چاہتی تھی لیکن ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ وہ خود جا کر اُسے مطلع کرتی۔ اس کا اُس نے ایک ہی حل سمجھا۔ وہ یہ کہ اُسے ایک خط کے ذریعے اپنے جانے کی اطلاع دے دے، چنانچہ اُس نے یہ خط لکھ کر اُسے سڑک والے لیٹر بکس میں ڈال دیا

خورشید بہن۔
خدا جانے تمھارے اور ساجدہ کے درمیان کس قسم کی گفت گو ہوئی ہوگی جو تم بغیر مجھ سے ملے ہی واپس چلی گئیں، بہر حال ہم نے اس سلسلے میں، انتہائی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے، جس وقت تمھیں یہ خط ملے گا میں اور امّی جان کراچی میں ماموں کے پاس بیٹھی ہوں گی۔ امی جان اس سلسلے میں اس سے بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ اُنھوں نے کر دیا ہے۔ نتیجہ اب خدا کے ہاتھ میں ہے، تم چاہو تو اس سلسلے میں اپنی مرضی سے کچھ کر سکتی ہو، خدا تمھیں تمھارے ارادوں میں کامیاب کرے، ہم دونوں کی دعائیں

تمہارے ساتھ ہیں، میں کراچی پہنچ کر تمہیں خط لکھوں گی۔ تم مجھے یہاں کے حالات سے آگاہ کرتی رہنا، امی تمہیں دعائیں دیتی ہیں۔

تمہاری مخلص

صفیہ

رات سات بجے کے قریب قدیر صاحب آفس سے فارغ ہو کر آگئے تھے طارق اس سے پہلے ہی آچکا تھا۔ اُنھوں نے مل کر کھانا کھایا۔ صفیہ اور بیگم صاحبہ دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ خدا کرے یہ لوگ کوئی پروگرام بنا کر باہر چلے جائیں اور ان کی غیر موجودگی میں وہ آسانی سے روانہ ہو جائیں۔ خُدا نے اُن کی یہ دُعا، دوسری نیک دُعاؤں کی جگہ جلدی ہی سُن لی۔ قدیر صاحب کو ایک دوست کی طرف سے اس سینما میں ریلیز ہونے والی ایک فلم دیکھنے کی دعوت ملی ہُوئی تھی، فلم غیر ملکی تھی اور اخباروں میں اُس کی بڑی تعریفیں کی گئیں تھیں۔ پہلے تو اُنھوں نے بیگم اور صفیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کے متعلق سوچا لیکن پھر اُن کی بیجا ناراضگی کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے اُنھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور طارق اور ساجدہ کو لے کر سینما چلے گئے۔

اب میدان اُن کیلئے بالکل صاف تھا۔ نو بجے کے قریب اُنھوں نے نوکر سے کہہ کر ٹیکسی منگوائی اور اُسے گھر کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے ریلوے سٹیشن کی راہ لی۔ اُنھیں صرف آدھ گھنٹہ گاڑی کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ دس بجے گاڑی اپنی منزل کیطرف روانہ ہُوئی تو اُن کی آنکھوں کی نیند اُڑ چکی تھی۔ اپنے برتھ پر بیٹھی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں وہ خالی خالی نظروں سے دیکھ

رہی تھیں، اندھیرا دم بدم بڑھتا چلا جارہا تھا اور گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوتی چلی جارہی تھی۔ اُنھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پلٹ کر صفیہ کے برتھ کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

باب ۱۳

خورشید کو جب صفیہ کا خط ملا تو اس وقت وہ گھر میں بستر پر پڑی، غم وغصہ میں پہلو بدل رہی تھی، رات بھر اُسے ساجدہ سے ہونیوالی گفتگو اور طارق کی منگنی کا خیال رہ رہ کر کچوکے دیتا رہا تھا۔ وہ بار بار سوچتی رہی تھی کہ کس طرح اپنی اس توہین کا بدلہ لے لیکن اُس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی، صفیہ کے خط نے اُسے ڈھارس بندھائی اور وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی، سہ پہر کا وقت تھا اور نادر ابھی باہر سے واپس آیا تھا اور ڈریسنگ رُوم میں لباس تبدیل کر رہا تھا۔ وہ وہیں جا پہنچی۔

”کیا بات ہے ——— تم اتنی پریشان کیوں ہو ———“

نادر نے پوچھا خورشید کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اُسے نہ اپنے خیالات پر قابو رہ گیا تھا اور نہ اظہار پر۔ زبان ہلانا بھی اسے دشوار ہو رہا تھا۔

”ہوُں ——— معلوم ہوتا ہے طارق کے سلسلے میں تمہیں

کوئی صدمہ اُٹھانا پڑا ہے ——؟" نادر نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ———" اس کی آواز میں مردنی صاف جھلک رہی تھی۔

"میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کے گھر کا پتا مل جائے۔ پھر اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا ———" نادر نے اُسے ڈھارس دلائی۔

"بھیّا —— اگر یہ ہو جائے تو میں موت سے بچ جاؤں گی" اُس نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھتی جاؤ ——— نادر جس کام کے پیچھے پڑ جائے وہ ہو کر رہتا ہے ——"

خورشید نے اُمید بھری نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ اب وہی ایک اُس کا سہارا رہ گیا تھا۔ ورنہ طارق کے معاملے میں اُس کی سب چالیں ناکام ہو چکی تھیں

سینما سے واپسی پر اُن لوگوں نے دیکھا۔ صفیہ اور بیگم صاحبہ کے کمروں میں تاریکی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں لیٹ گئی ہیں۔ لیکن اس وقت اُن کا سوئے ہوئے ہونا قدیر صاحب اور طارق کو کچھ عجیب سا لگا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے گھر کے تقریباً سبھی افراد ایک دُوسرے سے

علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے کمروں میں رات گئے تک جاگتے رہتے تھے۔ گھریلو تلخیاں اُن لوگوں پر بُری طرح اثر انداز ہوئی تھیں۔ آج معمول کے خلاف یہ خاموشی اُنھیں کچھ عجیب سی لگی۔ ویسے بھی قدیر صاحب سینما جانے کے بعد پکچر کے دوران میں کچھ دل برداشتہ سے رہے تھے۔ آج اُن کی چہیتی بیگم اُن کے ساتھ نہیں تھیں اور یہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ گھر میں ہوتے ہُوئے اُنھوں نے ان سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ دل میں اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوتے ہُوئے وہ بیگم صاحبہ کے کمرے کی طرف آئے دروازہ بند تھا۔ اُنھوں نے آہستہ سے دھکا دیا تو کھُل گیا۔ اُنھوں نے دیوار پر لگے ہُوئے بٹن کو دبایا مرکری بلب کی روشنی میں کمرہ بقیہ نُور بن گیا۔ اُن کی نظریں ایک دم بوکھلا کہ اِدھر اُدھر گھومنے لگیں۔ بیگم کا بستر خالی پڑا تھا اور وہ اپنے کمرے میں کہیں نہیں تھیں۔

طارق اور رفعت کے درمیان شادی سے پہلے آخری فلم دیکھنے کا پروگرام طے ہُوا تھا۔ اس کے مطابق طارق اگلے روز اوریگا سینما پہنچ گیا رفعت کو دیکھنے کیلیے اُس نے اردگرد ایک چکر لگایا اور زنانہ انتظار گاہ میں جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہ اُسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ سینما سے باہر کھڑا ہو کر ہر آتے جاتے رکشہ اور ٹیکسی کو گھورنے لگا۔ سوا تین بج چکے تھے اور اب تک رفعت کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ وقت کی کمی دیکھ کر اُس نے بکنگ سے جا کر دو بکس کے ٹکٹ خرید لئے۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں رفعت

کے آنے تک ہاؤس نہ فل ہو جائے فلم نئی نئی لگی تھی اور خاصہ رش لے رہی تھی۔ اس وقت وہ ذہنی طور پر پریشان بھی تھا کیونکہ بیگم صاحبہ اور صفیہ کا کراچی چلے جانے کا واقعہ کوئی معمولی اہمیت کا حامل نہیں تھا، وہ یہ خبر رفعت کو بھی سُنانا چاہتا تھا تاکہ اس کے بارے میں کوئی بہتر رائے طلب کر سکے اس لئے اس کو شدّت سے اُس کا انتظار تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رفعت وعدہ خلافی بھی کر سکتی ہے، لیکن پونے چار بج گئے اور وہ نہیں آئی۔

”خدا خیر کرے ——— یہ کیا ہونے لگا ہے۔ ——“ طارق نے ذہن میں سوچا۔ ایک تو امّی جان اور صفیہ کا چلے جانا اور اب رفعت کا نہ آنا ——— آخر ان دو واقعات میں کیا راز ہے ——؟“

تنگ آ کر وہ باکس میں جا بیٹھا۔ کھڑا رہ کر انتظار کرنے سے تو یہی بہتر تھا، لیکن وہ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ تک اندر بیٹھا ہوگا کہ جی کچھ گھبرانے سا لگا اور وہ اُٹھ کر باہر آ گیا۔

”سمجھ میں نہیں آتا ——— وہ کیوں نہیں آئی ——“ اُس نے بیتابی سے سوچا۔

”خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو ———“ اس کا دل ڈولنے لگا، گھبرا کر وہ پھر اندر بوکس میں چلا گیا اور طبیعت پر جبر کر کے وہیں بیٹھ گیا، آنکھیں پردۂ سکرین پر جمی ہوئی تھیں، لیکن وہ فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی آدمی کی نظروں کے سامنے جو منظر ہوتا ہے

وہ اسے نہیں دیکھتا بلکہ اس کا خیال کہیں دوسری جگہ بھٹک رہا ہوتا ہے اس کی آنکھیں سکرین پر تھیں لیکن خیال میں وہ رفعت کو تمام مانوس جگہوں پر ڈھونڈتا پھر رہا تھا، ذہن پر مایوسی اور خوف کے سائے بڑھتے چلے آرہے تھے اور دل بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ فلم درمیان میں ہی چھوڑ کر وہ باہر آگیا اور ٹیکسی لے کر رفعت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ——!

رفعت آج کالج کیلئے نکلی ہی تھی کہ بس سٹاپ پر ایک لڑکی اُس سے گھُلنے ملنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس نے اُسے پہلے کبھی یہاں سے سوار ہوتے نہیں دیکھا تھا، اُس کے دل میں ایک قسم کے شک وشبہ نے سر اُٹھایا لیکن پھر وہ یک لخت کافور ہوگیا، لڑکی نے بتایا کہ وہ بھی اس کے کالج کی طالبہ ہے۔ رفعت نے بھی کچھ دیر بعد اُسے پہچان لیا۔ وہ سائنس کی طالبہ تھی اور کبھی کبھی ضرور دیکھنے آتی رہی تھی۔ اسی لئے رفعت کو اُس کے چہرے پر شناسائی محسوس ہو رہی تھی اُس نے بتایا کہ اُنھوں نے سمن آباد میں نئی نئی رہائش گاہ تبدیل کی ہے، دونوں کالج پہنچنے تک اچھی خاصی بے تکلف ہوچکی تھیں واپسی پر انھوں نے چائے پینے کا پروگرام بنایا اور اپنی اپنی کلاسوں میں چلی گئیں۔

ایک بجے کے بعد رفعت کے پیریڈ ختم ہوگئے۔ اب وہ بالکل فارغ تھی۔ اُس نے ہم جماعتوں کے جھرمٹ سے نکل کر اِدھر اُدھر جھانکا۔ اس کی نظریں اپنی نئی نئی سہیلی توقیر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ اُسے کالج

کے داخلی دروازے کے قریب اس کی منتظر ملی۔

"کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی ——"، توقیر نے رفعت سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہُوئے کہا۔

"بس ذرا اِدھر اُدھر گھومنے میں دیر ہوگئی تھی ——" رفعت نے خوش اخلاقی سے جوابدیا۔

"چائے کہاں پی جائے ——" توقیر نے پوچھا

" رفعت سوچنے لگی۔ تین بجے اُسے طارق سے اوریگا سینما میں ملنا تھا۔ اس کے پاس ابھی ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ اُس نے سوچا اور بولی

" میرے خیال میں ہیکو بہتر رہے گا۔ وہاں سے مجھے گلبرگ جانے والی بس مل سکے گی ——"

" گلبرگ کس لئے جانا ہے ——"

" وہاں میری کسی سے appointment ہے ——"
رفعت نے ہلکی سی جھجک سے کہا۔

" کون ہے وہ ——" توقیر بھی ایک ہی کائیاں معلوم ہوتی تھی۔

" چھوڑو اس بات کو چلو ——"، دونوں رکشہ لے کر ہیکو پہنچ گیئں۔

توقیر نے پہلے آئس کریم کا آرڈر دیا۔ اس کے دوران اُن میں بے تکلفی ہوتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے چائے منگوائی ابھی رفعت

نے چائے کا آدھا کپ ہی ختم کیا تھا کہ نجانے کیا بات ہوئی رفعت کا سر چکرانے لگا، طبیعت کچھ گھبرا رہی تھی، توقیر کے پوچھنے پر اُس نے بتایا تو وہ بھی پریشان سی نظر آنے لگی۔

"چلو میں تمہیں اپنے چچا کے پاس لئے چلتی ہوں۔ وہ مزنگ چونگی کی طرف ہی مطب کرتے ہیں ——"

رفعت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُسے طارق سے بھی تین بجے ملنا تھا۔ اس لئے مزنگ چونگی سے آگے بس پکڑنا آسان سی بات تھی۔ توقیر نے فوراً ٹیکسی منگوائی اور بل ادا کر کے رفعت کو ساتھ لے کر اس میں بیٹھ گئی۔ رفعت کو پسینہ آ رہا تھا اور سر تیزی سے گھومنے لگا تھا ٹیکسی میں بیٹھ اُس نے توقیر کو ڈرائیور سے صرف اتنا کہتے سُنا۔

میری بہن کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ جلدی سے گلبرگ چلو۔ پھر اُس کو کوئی سُدھ بُدھ نہ رہی اُس کا سر توقیر کے شانے پر ڈھلکا ہُوا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ٹیکسی تیزی سے گلبرگ کے راستے پر رواں تھی۔

رفعت کی آنکھ کُھلی تو کمرے میں ڈوبتے سورج کی کرنیں شیشوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ وہ ایک دم اُٹھنے لگی۔

"لیٹی رہو —— لیٹی رہو —— ابھی تمہاری طبیعت سنبھلی نہیں۔" رفعت نے چونک کر دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس

کھڑی ایک بیحد دلکش اور چہرے سے ذہین وفطین نظر آنیوالی لڑکی پر اُس کی نظریں جم کر رہ گیئں۔

" میں کہاں ہُوں ــــــــ " اُس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

" میرا نام خورشید ہے ــــ "

" کون خورشید ــــــ ؟"

خورشید نے جواب میں ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اُس کی حریف ابھی اسے پہچاننے کے قابل نہیں ہُوئی تھی۔

" آپ اس گھر کو اپنا ہی تصور کریں اور اطمینان سے لیٹی رہیں، سب کچھ آپ کے علم میں آجائے گا ــــــ " اُس نے پرسکون آواز میں کہا۔ رفعت کمزور ذہن میں اچانک ایک شبہے نے سر اُٹھایا۔ اور اُس کے ساتھ ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ خورشید تو وہی لڑکی تھی جو اس کے طارق کے ساتھ شادی کرنے کیلئے "چکر" چلا رہی تھی ــــ " مگر میں یہاں کیسے پہنچی ــــ ؟" اُس نے پریشانی سے سر جھٹکتے ہُوئے سوچا۔

" کالج سے ہیکو ــــــ وہاں توقیر کے ساتھ گپ شپ۔ پھر سر کا چکرانا اور اس کے بعد بے ہوشی ــــ " اُسے سب کچھ یاد آگیا۔ " تو ــــ تو وہ اس وقت سے یہیں ہے ـــ " اُس نے پریشانی سے سوچا۔

" توقیر کہاں ہے ـــــــ ؟" اُس نے خورشید سے دریافت کیا

"ہُنہہ ـــــ وہ اپنا معاوضہ لے کر جا چکی ہے۔"

"کیا مطلب ـــــ"، رفعت نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

"اتنی بھولی نہ بنو اچھی لڑکی ـــ"، خورشید نے حکیمانہ انداز سے کہا۔

"تمہیں اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے ـــــ سمجھیں"

"لیکن کس لئے ـــــ میرا کیا قصور ـــــ" رفعت گھبراہٹ میں مُبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میری بنّو ـــــ اب تم ہمیشہ کیلئے غائب کر دی گئی ہو تمہارا کہیں سراغ نہ ملے گا اور نہ طارق تم سے شادی کر سکے گا ـــــ" خورشید نے طنزیہ قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا۔

"بڑا آیا تھا مجھے ٹھکرانے والا ـــــ اس چوہیا کی خاطر اُسے اس کے سائے کی بھی خبر نہیں ملے گی ـــ" خورشید جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ رفعت سُن سی رہ گئی۔

"تمہیں آج ہی رات کے وقت سرحد پار بھارتی بردہ فروشوں کے ہاتھ بیچ دیا جائے گا اور اس کے بعد تم کبھی اس ملک کا رُخ نہیں کر سکو گی۔ سمجھیں ـــــ"

رفعت کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی، صورتِ حال کی نزاکت کے احساس نے اُسے ایک دم اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کی آنکھوں

کے سامنے ستارے سے ناچے اور پھر گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ پھر سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

خورشید نے نفرت و حقارت کے ساتھ اس کے بے ہوش جسم کیطرف دیکھا اور پھر فاتحانہ انداز سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ دروازے کو باہر سے تالا لگانا وہ ہرگز نہیں بھولی تھی۔

طارق تھکا ہارا آٹھ نو بجے کے قریب گھر واپس پہنچا۔ رفعت اُسے کہیں بھی نہیں مل سکی تھی۔ اس کے گھر جانا اس کے خیال میں درست نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ متوسّط گھرانوں میں منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کا ملنا معیوب خیال کیا جاتا ہے اُس کا پروگرام کے مطابق نہ آنا طارق کیلئے جذباتی طور پر پریشان کن ضرور تھا لیکن اس کی اتنی زیادہ اہمیّت بھی نہیں تھی کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھا رہتا بہرحال اُسے رنج تھا کہ رفعت نے اُسے اپنے نہ آنے کے متعلق اطلاع کیوں نہ بھجوائی گھر آتے وقت بھی، دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ شائد اُس نے گھر ہی میں کوئی پیغام بھجوایا ہو ـــــــ چنانچہ وہ سیدھا ساجدہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اُسے دیکھ کر چونک پڑی۔

"کیا بات ہے بھیّا ـــــــ آج چہرہ اُترا اُترا کیوں ہے ـــــــ"

ساجدہ نے اُسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔

"کیا بتاؤں بجیا ——— بس کچھ نہ پوچھو ———"

"اوہ ہاں ———" ساجدہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"امی جان اور صفیہ کے متعلق ابا جان نے ماموں کو فون کیا تھا۔ اُنھوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ لوگ بخیریت کراچی پہنچ گئے ہیں اس لئے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ———" ساجدہ شائد یہ سمجھی تھی کہ طارق والدہ اور بہن کے یوں بغیر اطلاع دیئے خفا ہو کر چلے جانے کی وجہ سے پریشان ہے۔

"خدا کا شکر ہے کہ وہ لوگ بخیر و عافیت ہیں۔ لیکن اس وقت میں کسی اور وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہوں ———" طارق نے بُجھے بُجھے لہجے میں اُسے بتایا۔

"نہ جانے آج رفعت وقت دے کر بھی پکچر پر نہیں آئی اور نہ ہی اُس نے کوئی اطلاع بھجوائی ہے ———"

ہو سکتا ہے کسی وجہ سے گھر رُکنا پڑ گیا ہو، اس لئے زیادہ فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔؟" ساجدہ نے طارق کی بات کو توجہ سے سُن کر جواب دیا۔

"ہاں ——— آں ———" طارق نے بے دلی سے کہا، اُس کا دل اس دلیل سے مطمئن ہو رہا تھا۔

تو پھر اُن کے گھر سے پتہ کر لیا ہوتا ———" ساجدہ نے طارق کی پریشانی کا سبب سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"خیال تو یہی تھا لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہا کہ منگنی کے بعد میرا ان کے ہاں جانا کچھ معیوب سا لگتا ہے ــــــ"

"بات تو ٹھیک ہے ــــــ لیکن اس وقت اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ کل صبح میں چلی جاؤں گی اور پوچھ آؤں گی کہ اس کی غیر حاضری کا کیا سبب تھا ــــــ" ساجدہ کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی جسے طارق سمجھ رہا تھا لیکن خاموش رہا۔ ابھی دونوں یہ باتیں کر ہی رہے تھے۔ کہ نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کوئی نرگس بی بی باہر ٹیکسی میں بیٹھی گھر کے کسی فرد کو بلا رہی ہیں۔ دونوں بہن بھائی حیرت سے اُچھل پڑے نرگس رفعت کی بہن تھی اور اس وقت اس کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔

دونوں بھاگم بھاگ باہر پہنچے۔ نرگس کا رنگ اُڑا ہُوا تھا اور پریشانی کے آثار صاف طور پر اُس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے نا ــــــ" ساجدہ نے آگے بڑھ کر دریافت کیا۔ نرگس اس قدر بوکھلائی ہُوئی تھی کہ ٹیکسی ہی میں بیٹھی رہی تھی۔ اُس نے اُکھڑے اکھڑے لہجے میں بتایا کہ رفعت ابھی تک.... گھر واپس نہیں پہنچی ہے ــــــ!

طارق کے پاؤں تلے جیسے زمین نکل گئی۔ اُس کے دل میں پیدا ہونے والے خدشات دُرست ثابت ہو رہے تھے۔

"وہ گھر سے کب گئی تھی ــــــ؟" طارق نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ صُبح کالج کیلئے ہی روانہ ہُوئی تھی ــــــ"

"تم نے کالج سے پتا کیا ——"

"ہاں —— گیٹ کیپر ملازمہ نے بتایا ہے کہ وہ ڈیڑھ بجے کے قریب اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ کالج سے چلی گئی تھی۔

"اُس کی اُس سہیلی کو جانتی ہو۔ ——" طارق پریشانی کیوجہ سے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا، ہزاروں وسوسے اس کے ذہن میں سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

اس کا پتا میں نے احتیاطاً دریافت نہیں کیا تھا۔ ملازمہ کے قریب کچھ اور لڑکیاں بھی کھڑی تھیں، اگر میں فکرمندی اور تشویش کا اظہار کرتی تو اس سے طرح طرح کی باتیں پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

"پھر ——"! طارق نے پریشانی سے سوچتے ہُوئے کہا۔

"وہ کسی سہیلی ہی کے گھر میں نہ ہو ——"

"لیکن اُس کی کوئی سہیلی ایسی نہیں جس کے ساتھ وہ کالج سے باہر اتنی دیر تک رہنا پسند کرتی ہو ——" نرگس نے بتایا۔

"اچھا چلو پہلے گھر چلتے ہیں ——" طارق نے ساجدہ کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔

"ساجدہ —— تم گھر ہی میں رہو تاکہ ابّا جان کو اس سلسلے میں بتا سکو —— ہم گھر جا کر دیکھتے ہیں شائد وہ آگئی ہو"

"ٹھیک ہے —— ذرا جلدی اطلاع کرنا ——" ساجدہ

اُسے تاکید کرتی ہُوئی واپس چلی گئی ——— طارق نے ٹیکسی ڈرائیور کو دوبارہ سمن آباد چلنے کا کہا اور نرگس سے سوال و جواب کرنے لگا۔

گھر میں کہرام مچا ہُوا تھا۔ رفعت کی والدہ اور چھوٹے بہن بھائی ابھی تک جاگ رہے تھے۔ والدہ صاحب پریشان بیٹھے تھے اور اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔کہ رفعت کو کہاں ڈھونڈا جائے، طارق کو دیکھ کر اُن کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اپنی عزّت کا معاملہ تھا۔

"بیٹا کیا خیال ہے ——— پولیس کو اطلاع دے دی جائے ——" اُنھوں نے طارق کو سارے واقعات بتانے کے بعد مشورہ طلب کیا۔

"ہاں ——— پولیس کو اطلاع دینا ضرور چاہیئے لیکن اس سے پہلے ہمیں تمام ہسپتالوں میں ٹیلیفون کر کے دریافت کر لینا چاہیئے۔ خُدا نہ کرے وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر کسی ہسپتال میں پڑی ہو اور ہم اِدھر اُدھر پریشان ہوتے پھریں ——"

"اوہ ——— خدا نہ کرے ——— ہمیں تو اس بات کا خیال نہیں آیا تھا۔ خیر دیر آئید درست آئید۔ اب تم جلدی سے جا کر پتا کرو مجھ میں تو اب ہلنے کی طاقت بھی نہیں رہ گئی ہے" اُن کی آواز بھرائی ہُوئی تھی۔ طارق کا دل بھر آیا۔

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ابّا جان۔ انشاء اللہ

وہ جہاں بھی ہو گی بخیر و عافیت ہو گی۔"

اُس نے دل ہی دل میں خدا سے گڑگڑا کر رفعت کی سلامتی کیلئے دُعا مانگی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیکسی ابھی تک باہر کھڑی تھی، طارق اس کے ڈرائیور کو انتظار کرنے کیلئے کہہ آیا تھا۔ اس پر وہ نکل کھڑا ہوا۔ ایک ایک ہسپتال اور ڈسپنسری میں گیا لیکن آج کے زخمیوں یا بیماروں میں رفعت نام کی کوئی مریضہ کسی بھی جگہ داخل نہیں کی گئی تھی۔ رات کے ڈیڑھ بجے وہ اپنی ناکامی کی خبر سنانے اور مشورہ کرنے کیلئے اپنے گھر پہنچا۔ قدیر صاحب اور ساجدہ ابھی تک جاگ رہے تھے انھوں نے اس کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ ناکام واپس لوٹا ہے۔

معاملہ ایسا نہیں تھا جسے سرسری اور فوری قدم اُٹھا کر نپٹانے کی کوشش کی جاتی۔ رفعت کی گمشدگی ان کے عزت و وقار کا مسئلہ بھی تھی۔ اس لئے اس بات کو زیادہ سے زیادہ پوشیدہ رکھنے کی ضرورت تھی کیونکہ اس کے پھیلنے سے لوگوں کو طرح طرح کی باتیں بنانے کا موقع میسّر آسکتا تھا۔ اسی طرح یہ معاملہ پولیس کے سپرد کرنے سے پریس میں بھی آنے کا احتمال تھا جو زیادہ بدنامی کا موجب بنتا۔ لے دے کے ایک ہی طریقہ رہ جاتا تھا کہ قدیر صاحب اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر پولیس کے ذریعے اپنی ہونے والی بہو کی تلاش کرائیں۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت قابلِ عمل نہیں رہی تھی۔

چنانچہ قدیر صاحب نے اپنے ایک دوست کو جو محکمۂ پولیس میں ایس ایس پی تھا۔ رات تین بجے اس کے گھر میں جا کر جگایا اور انھیں ساری صورتِ حال سے مطلع کیا۔ قدیر صاحب کے ساتھ ایس ایس پی کے دیرینہ اور دلی تعلقات تھے۔ انھوں نے معاملے کی نزاکت کا فوراً احساس کیا اور ان کے ساتھ چل پڑے، پولیس ہیڈ کوارٹر میں جا کر اُنھوں نے فوری طور پر لاہور اور دیگر سرحدی حلقوں کے پولیس ٹیشنوں کو فوری چیکنگ کی کی ھدائیت کی۔ ہدایات چونکہ براہ راست ایس ایس پی کی طرف سے دی گئیں تھیں اس لئے پورے علقے کی پولیس فوراً حرکت میں آگئی اور راتوں رات رفعت کو تلاش کرنے کی مہم شروع ہو گئی۔

. . . .

رفعت کو دوبارہ ہوش آیا تو وہ ابھی تک اُسی کمرے میں بند تھی اس کے ہاتھ پاؤں ریشم کی مضبوط ڈوری سے باندھ دئیے گئے تھے اور وہ بے بس پڑی سوچ رہی تھی " خدا جانے میرے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔۔۔ ؟ طارق کیا سوچتا ہو گا ؟ کاش اسے پتہ چل جائے میں کہاں ہُوں۔ ماں باپ بہن بھائی اور طارق کی یاد نے اُسے بے چین کر دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، آنسو اس کے پیارے پیارے مکھڑے پر یوں لگ رہے تھے جیسے گلاب کی پتیوں پر شبنم کے قطرے۔ اس کا دل مایوسی اور غم کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا، خورشید کے چُبھتے ہُوئے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ آج اُسے رات کے

اندھیرے میں سرحد پار بھیج دیا جائے گا۔ پھر وہ کسے مدد کیلئے پکار سکے گی کون اس کی مدد کیلئے آئے گا۔ اُس کی عزت و عصمت کیسے محفوظ رہ سکے گی ــــــ؟ دل ڈوبتا اور درد و غم کے سیلاب میں ہچکولے کھاتا رہا اور وہ خون کے آنسو بہاتی رہی۔

خورشید اور نادر جب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ روتے روتے تھک ہار کر سو چکی تھی، چہرے پر عجیب طمانیت اور سکون تھا۔ حسین چہرہ گلاب کی طرح تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی پرسکون خواب میں کھوئی ہوئی ہو۔ نادر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اتنی خوبصورت ــــــ؟" اس نے للچائی ہوئی نظروں سے رفعت کے بے سُدھ جسم کو دیکھ کر خورشید سے کہا۔

"دیکھو بھیا ــــــ" خورشید اس کی نیت کو سمجھ گئی۔

"اس وقت خوبصورتی سے متاثر ہونے اور لُطف اندوز ہونے کا موقع نہیں۔ اسے کسی نہ کسی طرح آج ہی سرحد پار کرا دینا چاہیئے تاکہ ہمارے لئے پریشانی کا موجب نہ بن سکے ــــــ"

"بہت اچھا ــــــ" نادر نے بُجھے دل کے ساتھ کہا۔ اُس نے جیب سے رومال لے کر اس پر کلوروفارم چھڑکا اور سوئی ہوئی رفعت کے ناک پر رکھ دیا۔ نیند ہی نیند میں اسکے دو چار لمبے لمبے سانس لینے کے بعد رومال اس کے نتھنوں سے ہٹا لیا اور ایک دوسرا رومال لے کر اُس

اس کے منہ پر پٹی باندھ دی۔

"یہ کس لئے ــــــ؟" خورشید نے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ راستے میں اسے ہوش آجائے۔ پھر یہ شور مچا کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنیکی کوشش کر سکتی ہے ــــــ"

اس نے اُسے بتایا۔ ہاتھ اور پاؤں پہلے ہی ریشم کی مضبوط ڈوری سے بندھے ہوئے تھے اور وہ ہلنے جُلنے سے قطعاً معذور تھی۔

"تم یُوں کرو ــــــ" نادر نے خورشید کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم جا کر گراج سے اپنی بڑی گاڑی نکال لاؤ اور اُسے اس کمرے کے سامنے لا کر کھڑی کر دو۔ انجن سٹارٹ ہی رکھنا۔ میں اسے اٹھا کر اس میں لٹا دوں گا ــــــ"

"پچھلی سیٹ مناسب رہے گی ــــــ؟" خورشید نے استفسار کیا۔

"ہاں ــــــ اس گاڑی کے شیشے گہرے رنگوں کے ہیں اس لئے باہر سے اندر کی طرف دیکھا نہیں جا سکتا ــــــ" نادر نے اُسے سمجھایا۔ اور جانے کا اشارہ کر کے خود رفعت کے بے ہوش جسم کو اٹھانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ خورشید تقریباً دوڑتی ہوئی گراج کی طرف چلی گئی، رات کے ٹھیک ڈھائی بجے طارق اپنی لمبی سی سیاہ کار میں تیزی سے لاہور کے ایک سرحدی گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

طارق، قدیر صاحب اور رفعت کے گھر والے بیحد پریشانی میں مبتلا تھے سب کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ ہر لمحے یہ خیال آتا تھا کہ شائد اب رفعت کا کچھ پتا چل جائے۔ اب کوئی سراغ ملے لیکن ابھی تک اس معاملے میں مایوسی ہی ہوئی تھی طارق اور اس کے والد قدیر صاحب ابھی تک، پولیس وائرلیس روم کے باہر اپنے دوست ایس ایس پی ونود کے ساتھ بیٹھے گھڑیاں گن رہے تھے۔ ایس ایس پی ونود بھی ان کی پریشانی میں یکساں شریک تھے۔

ساجدہ اس وقت کوٹھی پر اکیلی تھی۔ وہ ہر چند منٹ کے بعد بے چینی سے ٹیلیفون کی طرف بڑھتی لیکن پھر رک جاتی اس کا گھر میں رہنا بھی بڑا ضروری تھا ورنہ وہ رفعت کے گھر چلی جاتی تاکہ اس کے گھر والوں کو دلاسا دے سکے، رفعت کے متعلق تازہ ترین صورتِ حال جاننے کیلئے بھی وہ بےچین تھی اس کے والد نے دو تین بار پولیس ہیڈ کوارٹر سے فون پر پرسکون رہنے کی ہدایت کی تھی اور آرام کرنے کیلئے کہا تھا۔ لیکن اس وقت آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اُس کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا بیگم صاحبہ اور صفیہ کی رفعت کی گمشدگی سے عین ایک روز پہلے روانگی اُسے بڑی عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل یہ ماننے پر بھی تیار نہیں ہو سکتا تھا کہ رفعت کی گمشدگی میں صفیہ یا اس کی امّی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن، نجانے اُسے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ رفعت کی گمشدگی میں خورشید کا ہاتھ

ضرور ہے لیکن اس وقت خورشید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کوئی معنی نہیں رکھتی تھی، ممکن تھا وہ اطلاع کو ان کے خاندان کی بدنامی کیلئے استعمال کرتی۔ بس اسی بات کو مدِنظر رکھ کر اُس نے خورشید سے ٹیلیفون پر کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔ لیکن ایک بات کے متعلق اس نے اپنے آپ کو قطعاً نہ روکا، وہ کراچی میں بیگم صاحبہ اور صفیہ کو اس سلسلے میں فون پر مطلع کر دینا ضرور چاہتی تھی، ممکن تھا کہ انھیں اس سلسلے میں کچھ علم ہو۔ اگر کوئی ایسی بات نہ بھی ہوئی تو بھی اطلاع دے دینے میں ایک مصلحت ضرور تھی ساجدہ سمجھتی تھی کہ بیگم صاحبہ کی کراچی روانگی دراصل ان کے احساسِ شکست کی آئینہ دار ہے۔ وہ درپردہ طارق اور اُس کے والد کے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھیں لیکن اپنی شکست کو تسلیم کر لینا اُن کے بس میں نہ تھا۔ مصالحت کی اب ایک ہی صورت تھی کہ کس طرح اُنھیں واپسی کا کوئی بہانہ مہیا کیا جائے تا کہ وہ سچ کو سچ تسلیم کرتے ہوئے شرمندگی محسوس نہ کریں، یہ بہانہ اس وقت رفعت کی گمشدگی کے حادثے کی صورت میں مہیا ہو چکا تھا۔ چنانچہ ساجدہ نے کمالِ دانشمندی سے کام لیتے ہوئے اسی وقت ٹیلیفون کال بک کی، رات کا وقت تھا اس لئے فوری طور پر سلسلہ مل گیا۔ کراچی سے فون پر اس کے ماموں بول رہے تھے، بھرائی ہوئی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوتے سوتے اُٹھے ہیں۔

"السلام وعلیکم بھئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے نا"

اس کے ماموں نے آواز پہچانتے ہوئے کہا۔

"تمہاری امّی اور بہن ٹھیک ٹھاک ہیں ——"

"ماموں فکر کی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں امّی سے ایک نہایت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز انھیں بلا دیجیے ——"

"اچھا بیٹی ہولڈ کرو —— میں انھیں بلاتا ہوں ——"

دو تین منٹ کے بعد دوسری طرف اس کی امّی بول رہی تھیں۔

"کیا بات ہے ساجدہ —— خیریت تو ہے نا ——" بہت دنوں بعد اُس کی ماں اس سے اچھی طرح بول رہی تھی، اس نے اطمینان کا سانس بھرا اور بولی۔

"امّی دراصل یہاں ایک غیر متوقع بات ہوگئی ہے ——"

"خدا خیر کرے بیٹی —— کیوں کیا ہوا —— طارق تو خیریت سے ہے نا۔

"جی ہاں —— وہ تو خیریت سے ہیں لیکن اس وقت نہایت پریشان اور بےحال ہوئے پڑے ہیں ——"

"کیوں کیا ہوا ——" اُن کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

"رفعت کا آج دوپہر سے کوئی سراغ نہیں مل رہا۔"

"کون رفعت —— طارق کی منگیتر"

"ہاں امّی ڈر ہے کہ اُسے ——" لفظ ساجدہ کے ہونٹوں ہی میں رہ گئے۔ دوسری طرف اُس کی والدہ کے ہاتھوں سے گھبراہٹ

میں ریسیور گر پڑا تھا۔

"ہیلو —— ہیلو —— ساجدہ میں تمہارا ماموں بول رہا ہوں۔ تمہاری امّی بے ہوش ہو گئیں ہیں —— میں ابھی دوبارہ رنگ کروں گا" فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ساجدہ کو پسینہ آگیا تھا۔

"یا الٰہی میری امّی خیریت سے ہوں ——" بدحواسی کے عالم میں اُس کے منہ سے دُعا نکلی۔ ماں کی محبت نے اچانک جوش مارا تھا اس وقت وہ ان سے اتنی دُور تھی کہ اُن کی کوئی خدمت بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اُمید و بیم کے حالت میں وہ فون کے پاس ہی بیٹھی رہی ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ بن کر گزر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے فون کی گھنٹی بجی اُس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

"کون صاحب"

"ساجدہ میں تمہارا ماموں بول رہا ہوں۔ تمہاری امّی ہوش میں آگئی ہیں، مجھے صورت حال کا پتا چل گیا ہے ہم لوگ کل سہ پہر کے ہوائی جہاز سے آرہے ہیں ——" ساجدہ نے اطمینان کا ٹھنڈا سانس لیا۔

"لیکن تم ہمیں اس سلسلے میں صُبح ضرور رنگ کرنا تاکہ صورتِ حال کا علم ہو سکے۔"

"اچھی بات ماموں جان ——"

"قدیر صاحب کہاں ہیں ——" اُنھوں نے پوچھا۔

" ماموں! طارق بھائی جان کے ساتھ پولیس اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے ہیں" اُس نے بتایا۔

" انھیں کہنا کہ مجھے بہت افسوس ہے۔ خدا کرے رفعت کا جلد سراغ مل جائے۔ ہم سب لوگ کل پہنچ جائیں گے۔ اچھا اب خدا حافظ مجھے تمہاری امیؒ کی بھی خبر لینی ہے ——— "

" خدا حافظ ——— " سلسلہ منقطع کر کے اُس نے پولیس اسٹیشن رنگ کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ ابھی تک رفعت کا کچھ سراغ نہیں ملا اور قدیر صاحب اور طارق گھر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ فون بند کر کے اُس نے گھڑی کو دیکھا۔ چار بج رہے تھے۔

" اُسے ابّا جان اور بھیّا کو امیؒ اور ماموں کے متعلق بتلانا چاہیئے یا نہیں۔" اُس نے دل میں سوچا، پھر اُس نے کچھ فیصلہ کر لیا اور صوفے پر آرام سے بیٹھ کر قدیر صاحب اور طارق کا انتظار کرنے لگی، شب بیداری کی وجہ سے اس کا بدن کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔

ساڑھے تین بجے نادر اپنے ایک دوست کے پاس سرحدی گاؤں میں پہنچا۔ یہاں اس کے دوست جیون کا اڈہ تھا۔ جہاں سے عورتیں اور سمگلنگ کی اشیاء بھارتی علاقے میں بھیجی جاتی تھیں وہ اس وقت اسے اپنے ہاں دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

" خیریت ——— خیریت ——— " جیون نے نادر

سے بغل گیر ہوتے ہُوئے کہا۔

"آج اس وقت کیسے ——"

"گاڑی کے پیچھے دیکھو ——"، نادر نے اُسے آگاہ کیا۔

"یہ کیا ہے ——"

"دانہ —— اندر لے چلو ——"

"جیون نے بے ہوش رفعت کو کندھے پر اُٹھا لیا اور اسی طرح اُٹھائے ہُوئے اندر لے گیا۔

"او ——"، پلنگ پر لٹاتے ہُوئے بے ہوش رفعت کی صورت دیکھ کر جیون کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"اتنی نازک شے کو اس طرح باندھ کر لائے ہو ظالم"

"ناگن ہے ناگن ——"، نادر نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"محتاط رہنا کہیں ڈس نہ لے ——"

"اس کا کیا کرنا ہے —— ؟" جیون نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"سرحد پار بھجوانا ہے —— فوراً ——"

"یار ——" جیون نے لالچ سے رفعت پر نظر ڈالی۔

"یہیں رہے تو کیا بُرا ہے"

"بُرا تو کچھ نہیں —— لیکن خورشید کا خیال یہی ہے ——"، نادر

نے اُسے بتایا۔ جیون کے دل میں خورشید کیلئے ان گنت قسم کے جذبے موجود تھے۔ خوشنودگی حاصل کرنے کا موقع دیکھ کر وہ جھٹ سے بولا۔

"خورشید کی خواہش تو کسی طور پر ٹالی نہیں جاسکتی، لیکن یہ اب کل رات ہی جاسکے گی کیوں کہ پھیرے والے جا چکے ہیں۔"

"اچھا ——— لیکن بھول نہ جانا ——— اسے کل رات سرحد پار ہونا چاہیئے۔"

"فکر نہ کرو یار ———"

"اچھا پھر میں چلتا ہُوں ———"

"کیوں ——— بیٹھو کچھ کھا پی جاؤ ———" جیون نے اُسے ٹھہرانا چاہا۔

"نہیں بھئی ——— خورشید انتظار کر رہی ہوگی ———"

"اچھّا اچھّا ——— پھر خدا حافظ ———" خورشید کو میرا سلام کہنا۔"

"اچھّا اچھّا ———" نادر نے کار سٹارٹ کرتے ہُوئے کہا۔ وہ جیون کے جذبات سے واقف تھا۔ گاڑی گاؤں سے نکل کر شاہراہ کی طرف بڑھنے لگی۔

ایس ایس پی ونود ایک منجھے ہُوئے منتظم تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ جبری اغوا ہونے والی لڑکیوں کو عموماً حسد یا خاندانی منافرت

کی بنا پر تباہ کیا جاتا ہے، رفعت کے معاملے میں ظاہر ہی طور پر انھیں یہی محسوس ہُوا تھا کہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے۔ لیکن وہ طارق اور اس کے والد کی فراہم کی ہوئی اطلاعات سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ پولیس وائرلیس آفس سے انھیں رخصت کرنے کے بعد وہ رفعت کے گھر پہنچے جہاں کا پتا انھوں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔ وہاں سے انھیں پتا چلا کہ رفعت کی منگنی کے سلسلے میں طارق کے گھر میں تھوڑی بہت میں میخ نکالی گئی تھی اور اس سلسلے میں طارق کی والدہ بہت زیادہ سرگرم تھیں۔ یہ اطلاع بڑی اہم تھی ونود صاحب فوراً قدیر صاحب کی کوٹھی پہنچے، وہ دن اور رات کے تھکے ہارے اب لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے، ونود صاحب نے انھیں علیحدہ لے جا کر تھوڑی دیر گفتگو کی جس میں انھیں پتا چل گیا کہ واقعی رفعت کی والدہ اس سلسلے میں سرگرم تھیں اور ان کے ذہن میں ایک دوسری لڑکی کے متعلق ہی طارق کی بیوی بنانے کا خیال تھا۔ وہ دوسری لڑکی کون تھی ---------؟ اس سوال کا جواب دینے کیلئے معاملے کو طارق کے سامنے رکھا گیا۔ طارق نے پہلے تو تذبذب سے کام لیا کیونکہ خورشید کیطرف سے کبھی یہ احتمال نہیں ہُوا تھا کہ وہ اس قسم کا کردار بھی ادا کر سکتی ہے لیکن حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ خورشید کا نام اور اس کی رہائش کے محلِ وقوع کو سنتے ہی ونود صاحب چونک سے گئے لیکن انھوں نے ان لوگوں کے سامنے کسی بات کا اظہار نہ کیا۔ اور اجازت لے کر چلے آئے اب ان کی جیپ کا رُخ گلبرگ کی طرف تھا

جیپ کا وائرلیس سیٹ آن تھا اور وہ ہدایات دے رہے تھے۔

"ہیلو ـــــ ہیلو ـــــ فلائنگ سکواڈ ـــــ ہیلو۔ ایس ایس پی ڈبلیو کالنگ۔"

چند لمحوں بعد سلسلہ مل گیا۔ اُنھوں نے پولیس کی ایک گارد کو فوری طور پر خورشید کی رہائش گاہ کا خفیہ محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ درمیانی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے بڑھے پولیس کی ایک جیپ ان کے ساتھ آ کر مل گئی تھی اور پیچھے پیچھے آ رہی تھی، وہ خورشید کی کوٹھی پر چھاپہ مارنے جا رہے تھے۔ خورشید اور نادر کی پُرانی ہسٹری سے وہ بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ دونوں بہن بھائی جرائم پیشہ، لیکن کبھی قانون کی زد میں نہیں آئے، اب کے وہ اُنھیں بچ کر نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ معاملہ اُن کے عزیز ترین دوست کی بہو کے اغوا کا تھا۔

نادر کا پاؤں ایکسی لیٹر کو دبائے چلا جا رہا تھا۔ اُسے نیند آ رہی تھی اور چاہتا تھا کہ فوراً گھر پہنچ کر سو جائے کار تیزی سے ڈرائیو کرتے ہُوئے وہ اپنی کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ جلدی میں ساتھ والی کوٹھی کے باہر والے گھنے درختوں کے نیچے کھڑی پولیس جیپ کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ گاڑی گیراج میں بند کر کے وہ باہر نکلا ہی تھا کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔

ہینڈز اپ ———" ساتھ ہی اُس پر ٹارچ کی روشنی پڑی مدھم روشنی میں اُسے ایس ایس پی اور سپاہیوں کی وردیاں نظر آئیں تو وہ بوکھلا گیا۔

"تم پولیس کی حراست میں ہو ———!" ایس ایس پی نے اُس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا، اس نے چپ چاپ ہاتھ اُٹھا دئیے۔ دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اُسے دونوں بازوؤں سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"میں نے کیا کیا ہے ———" اس نے ہلکا سا زور لگاتے ہوئے کہا۔

"خاموشی سے چلے آؤ ———" ایس ایس پی نے کہا اور وہ جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ اُسے بھی پچھلی جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اور پارٹی روانہ ہو گئی ——— چند لمحوں بعد وہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں رُکے۔ اُسے ہاتھ باندھ کر سوال وجواب کے کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ اس وقت صُبح کی اذان ہو رہی تھی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ نادر نے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ اُسے ایک طرف پڑی ہوئی کرسیوں کا احساس ہُوا۔ وہ ان میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم پسینے سے تر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر "چکر" کیا ہے خورشید پر کیا گزری اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ یقیناً وہ بھی محفوظ نہ ہو گی۔ کیونکہ پولیس اُس کی موجودگی میں شائد اسے اس طرح نہ پھانس سکتی اُسے کسی نہ کسی طرح

مطلع کر دیا جاتا ۔

ٹارچ کی آواز سے کمرہ روشن ہوگیا۔ نادر چکرا گیا۔ اُس کے سامنے والی کرسی پر خورشید بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں رومال ٹھونس دیا گیا تھا تاکہ بول نہ سکے ۔

"ہاں ۔۔۔ تو اب تم لوگ مجھے بتاؤ گے کہ رفعت کا کیا ہوا؟" ایس ایس پی ونود نے اندر داخل ہوتے ہوئے ترشی سے کہا۔ خورشید اور نادر کے چہرے ایس ایس پی کو دیکھ کر زرد پڑ گئے تھے ۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر نادر اور خورشید نے رفعت کا پتا بتا کر اپنے جرم کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایس ایس پی صاحب نے فوراً متعلقہ تھانے کو اطلاع کروائی اور خود بھی پولیس گارد کے ہمراہ دو گھنٹوں کے اندر اندر سرحدی گاؤں میں جیون کے اڈے پر جا چھاپہ مارا۔ وہاں سے رفعت کے علاوہ دو اور محبوس لڑکیاں بھی برآمد ہوئیں جنھیں ایک ایک دو دو ماہ پہلے اغوا کیا گیا تھا اور جن کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ لاکھوں روپے کی مالیت کا سمگل شدہ سامان بھی برآمد ہُوا۔ جیون اور اس کے چار گرگے گرفتار کر لئے گئے۔ رفعت کلوروفارم کی وجہ سے ابھی تک بے ہوش تھی اُسے پولیس کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا اور لاہور واپس آ کر پولیس ہسپتال میں طبّی امداد دی گئی۔ جلد ہی وہ ہوش میں آگئی اور اپنے آپکو ہسپتال میں پولیس ہسپتال کی نرسوں کے درمیان گھرا دیکھ کر رونے لگی، اتنے میں ایس ایس پی ونود اندر آ گئے ۔

"چلو بیٹی تمہیں گھر چھوڑ آئیں ----" انھوں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔ وہ اُسے سہارا دے کر جیپ تک لائے پہلے اُن کا ارادہ تھا کہ اُسے اس کے گھر چھوڑ آئیں لیکن پھر کچھ سوچ کر انھوں نے جیپ کا رُخ قدیر صاحب کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ رفعت خاموش بیٹھی رہی۔

"لو بھائی قدیر —— میں تمہاری بہو کو ڈھونڈ لایا——"، اُنھوں نے پیار سے رفعت کا شانہ تھپتھپا کر کہا۔

"میری بچی ——" قدیر صاحب نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

"میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں ——" وہ ایس ایس پی صاحب سے کہہ رہے تھے۔

"شکریہ کس بات کا —— بہو تمہاری ہو گی ہماری تو بیٹی ہے۔ ہم اپنی بیٹی کو ڈھونڈ کر لائے ہیں ——"، اُنھوں نے مصنوعی خفگی بھرے انداز میں کہا۔ باوجود انتہائی جذباتی کیفیت میں ہونے کے قدیر صاحب کے چہرے پر بڑی دلنواز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُن کے بچپن کا دوست ایس ایس پی ونود کتنے اڑے وقت کام آیا تھا۔ اُن کا دل احساسِ تشکر سے بھر آیا۔ اتنے میں ساجدہ بھی باہر آگئی۔ دونوں گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں۔

دوسری طرف گیارہ بجے تک رفعت کے گھر والوں کو اس کے متعلق

کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ بچے تو خیر رو دھو اور تھک ہار کر سو گئے تھے لیکن بڑوں کی آنکھوں سے نیند تو شاید ہمیشہ کیلئے اڑ چکی تھی۔ تڑکے چار بجے کے قریب آخری بار انھیں اطلاع ملی تھی کہ ابھی تک رفعت کا کوئی پتہ نہیں چلا اس کے بعد سے ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی۔ طارق بھی نہیں آیا تھا۔ گیارہ بجے رفعت کے ابا نے پڑوسیوں کے ہاں سے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ رفعت مل گئی ہے اور اس وقت اُسے ایس ایس پی صاحب اپنے ساتھ قدیر صاحب کی کوٹھی پر لے جا چکے ہیں۔ گھر میں ایکدم خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فوراً ایک ٹیکسی منگوائی گئی اور تقریباً سب گھر والے قدیر صاحب کے ہاں روانہ ہو گئے۔

اِدھر کراچی میں بیگم صاحبہ اور صفیہ بیحد بےچین تھیں بیگم صاحبہ کو اپنی غلطی کا اعتراف تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اور اب رفعت کی گمشدگی اور بیٹے کی پریشانی کا سوچ کر بُری طرح پریشان ہو گئیں انھوں نے اپنے بھائی کو فوری طور پر واپسی کا بندوبست کرنے کیلئے کہا۔ دس بجے کی فلائٹ والے ہوائی جہاز پر سیٹیں بک کی گئیں۔ اور وہ لوگ بمع صفیہ کے ماموں اور ممانی کے لاہور پہنچ گئے۔

ابھی گھر میں رفعت کی امی اور بہنیں ہی اُس سے مل ملا رہی تھیں کہ بیگم صاحبہ اور صفیہ کی ٹیکسی بھی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ ایک شور سا مچ گیا، دِلوں کی کدورتیں اور ناراضگیاں دھل گئی تھیں۔ ساجدہ بڑی بہن کے گلے لپٹ کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگ رہی تھی اور

طارق امّی کے قدموں سے لپٹا ہوُا تھا اور بیگم صاحبہ اپنے بھرے پُرے گھر میں خوشیوں کا سیلاب دیکھ کر خوشی سے پھُولے نہیں سما رہی تھیں، اُنھیں احساس ہو گیا تھا کہ اُنھوں نے اس معاملے میں اپنی ضد پر اڑ کر گھریلو سکون کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ وہ اپنے خاوند سے بھی شرمندہ تھیں۔ قدیر صاحب نے انھیں علیحدگی میں لے جا کر گلے سے لگا لیا اور وہ اس بات پر بے طرح سسکنے لگیں۔ زندگی میں پہلی بار اُنھیں اپنے خاوند کی محبت کا سچّا احساس ہُوا تھا۔

خورشید اور نادر پولیس کی حراست میں تھے۔ ان پر مقدمہ قائم کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ طارق اور رفعت کی شادی کیلئے فوری طور پر دن مقرّر کر دیئے گئے تاکہ اس نیک کام میں مزید دیر نہ ہو۔ شادی سے پہلے وہ دونوں ایک بار پھر لارنس کے اس مخصوص بینچ پر ملے اور دیر تک بیٹھے آئندہ زندگی کے پروگرام بناتے رہے اُن کے سامنے یاسمین کی کلیاں اُن کے دلوں کی طرح لہلہلاتے ہوُئے اپنی مہک لُٹا رہی تھیں۔
